رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

جلد (۱۱) عدد (۴)
شوال ۱۳۵۶ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت فی پرچہ (۸؍)
قیمت سالانہ (صمہ)

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

اشاعتِ اسلام اور تلوار دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

جنگ دوسرے مذاہب میں جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت اور عیسائیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

جنگ اور تہذیب جدید بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت مجلد (صہ) انگریزی (صہ) سکہ عثمانیہ غیر مجلد (للعہ) انگریزی (دیعہ) سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن (حیدرآباد دکن)

اطلاع

۱۵ ؍ ذی القعدہ ۱۳۵۶ھ (۱۸ ؍ جنوری ۱۹۳۸ء) کو دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد میں بند ہوگا اور ۲۰ ؍ ذی القعدہ (۲۳ ؍ جنوری) کو دارالاسلام (جمال پور متصل پٹھان کوٹ ۔ پنجاب) میں کھلے گا۔

تاریخ مذکور کے بعد منیجر یا ایڈیٹر کے نام جس قدر خطوط لکھے جائیں وہ پتۂ ذیل پر روانہ کیے جائیں۔

نیز معاصرین کرام سے بھی گذارش ہے کہ تاریخ مذکور کے بعد پتہ ذیل پر اپنے موقر جرائد ارسال فرمائیں۔

دفتر ترجمان القرآن ۔ دارالاسلام (پٹھان کوٹ ۔ پنجاب)

دسمبر ۱۹۳۷

فہرست مضامین

شوال ۱۳۵۶ھ۔ جلد (۱۱) عدد (۴)

اطلاع

ماہ ذی القعدہ کا پرچہ ترجمان القرآن کا خاص نمبر ہوگا جس میں محرم سے رجب تک کے اشارات کا مجموعہ درج کیا جائے گا۔ ان مضامین کو اب ازسرنو مرتب کیا گیا ہے اور ان میں بہت سے جدید مباحث کا اضافہ کردیا گیا ہے نیز آخر میں تمام ان اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے جو ان مضامین کی اشاعت کے بعد کیے گئے ہیں۔

منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پنڈت جواہرلال کے جو خیالات گذشتہ اشاعت میں پیش کیے گئے ہیں ان کو محض ایک شخص کے ذاتی خیالات سمجھکر سرسری طور پر نظر انداز کردینا صحیح نہیں ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اب یہ پنڈت جی کے ذاتی خیالات نہیں ہیں بلکہ کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔ کانگریس نے مارچ ۳۷ء کے بعد سے جمہور مسلمین کے ساتھ ربط قائم کرنے کی جو تحریک (Muslim Mass Contact Movement) کے نام سے شروع کی ہے وہ ٹھیک انہی راستوں پر چل رہی ہے جو پنڈت جی نے تجویز کیے ہیں۔ پورا غیر مسلم پریس جو کانگریس کے زیر اثر ہے مسلمانوں میں اسلامی قومیت اور اسلامی تہذیب کے خلاف بغاوت پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ جس گوشے سے اس بغاوت کا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے، اس کا بڑے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے، اور ہر اُس آواز کو جو اسلامی شعور کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے بلند ہوتی ہے "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کس کر دبا دیا جاتا ہے۔

اس طرز عمل کی توضیح کے لیے میں صرف دو مثالیں پیش کرونگا۔ مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ اگر تحدی کی جائے تو ان کا ایک معتد بہ ذخیرہ میرے پاس محفوظ ہے جسے ضرورت کے وقت پیش کرسکتا ہوں مگر چونکہ میں بحث کو طویل نہیں دینا چاہتا، اس لیے صرف دو مثالوں پر اکتفا کرونگا جن سے اس تحریک کے رجحانات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

ابھی چار پانچ مہینے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان نژاد طالب علم نے برملا اعلان کیا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں اور مسلمانوں نے اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ جو شخص خود اسلام سے منکر ہے وہ کسی انتخاب میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے امیدوار بننے کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ایک کانگریسی اخبار (ہندوستان ٹائمز) لکھتا ہے۔

"اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کے لیے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے پہلے لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائے گا۔ اس سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جس کو ہمارے آقاؤں نے اس قدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے اس وقت بیکار ہو کر رہ جائے گا جب کہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہیں گے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کریں گے۔ لہٰذا مسٹر نقوی کو مستقبل کے لیے ایک فال نیک سمجھنا چاہیے اور کیا خبر کہ وہ آنے والی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں۔"

اس مضمون میں انگلستان کے اُن ملاحدہ کو مثال میں پیش کیا گیا ہے جنہوں نے حریت فکر کا علم بلند کیا تھا اور اپنی مذہب پرست قوم کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں، مثلاً چارلس بریڈلا، مارلے اور رابرٹ انگرسول۔ پھر اسلام سے بغاوت کرنے والے اس نوجوان کو ان "بہادروں" کی صف میں جگہ دے کر اس کی ہمت و جرأت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ہیں۔

ایک دوسرا کانگریسی اخبار (تیج) اپنی ۱۴ راگست ۳۷ء کی اشاعت میں ایک مسلمان عورت کا خط شائع کرتا ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"جب میرٹھ میں پوجیہ پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے تو میں اپنے خاوند سے چھپ کر

جلسہ دیکھنے گئی اس وقت سے میرا دل بے چین رہنے لگا میں نے اپنے مکان پر قومی جھنڈا لگا دیا لیکن جب میرے خاوند نے اسے پھاڑ ڈالا تو میں نے سارا دن نہ تو کھانا کھایا نہ رات کو سوئی بلکہ تمام رات اور دن برابر روتی رہی۔ جب میرے خاوند نے میرے پیارے پنڈت جواہر لال کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا اگر ان کی شان میں کچھ کہا تو جان کھو دوں گی۔ چنانچہ میں اسی دن لڑکر اپنے باپ کے گھر چلی آئی ہوں۔ اب جبتک میرا خاوند معافی نہ مانگے گا، اپنے مکان پر کانگریس کا جھنڈا نہ لگائے گا، اور کانگریس کا ممبر نہ بنے گا، میں اس کی شکل بھی نہ دیکھوں گی۔"

ایڈیٹر صاحب! میں نے پچاس مسلمان عورتیں تیار کر رکھیں ہیں جو پردے کو چھوڑ کر ہر وقت کانگریس کا کام کرنے کو تیار ہیں، مگر ہمارے گھر والے ہمکو بہت تنگ کرتے ہیں۔

اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ اور آپ ہمارے پوجیہ پنڈت جواہر لال سے کہیے کہ ہم مسلمان عورتیں کیا کریں؟"

بہت ممکن ہے کہ یہ خط فی الواقع کسی مسلمان عورت کا لکھا ہوا نہ ہو، اور محض ایک جعل ہو لیکن اگر یہ جعل ہے تو یہ اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ "لشکر آزادی" کے ان نقیبوں کے مافی الضمیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "قوم پرستی" کے یہ علم بردار مسلمان مردوں اور عورتوں کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں، "آزادی کی فوج" کے لیے کس قسم کے سپاہی ان کو مسلمانوں میں درکار ہیں، اور کم از کم کس حد تک اصول اسلام سے منحرف ہونا ضروری ہے جس کے بعد وہ کسی مسلمان کو "قوم پرست" تسلیم کر سکتے ہیں۔

یہ بغاوت صرف غیر مسلموں ہی کی زبان و قلم کے ذریعہ سے نہیں پھیلائی جارہی ہے بلکہ خود مسلمان بھی اس کی اشاعت کے لیے آلۂ کار بنائے جارہے ہیں۔ مسلمان لیڈر، مسلمان اہل قلم اور مسلمان رسائل و جرائد

انہی تمام خیالات کو مسلمانوں میں پھیلانے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بہکانے کے لیے غیر مسلموں کی بہ نسبت خود مسلمان زیادہ کارگر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس کے لیے آپ کو جتنی مثالوں کی ضرورت ہو، میں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر یہاں صرف ان حضرات کی تحریروں سے استناد کروں گا جو کانگریس میں کوئی نہ کوئی "سرکاری" یا ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں:

بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود صاحب، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکرٹری رہ چکے ہیں، اور اس وقت صوبۂ بہار کی وزارت میں واحد مسلمان وزیر ہیں، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

> "مختصر یہ کہ اخلاقی سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید نظام مذہبی کی نشو و نما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔ اجنبی تھے، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیا" (جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)۔

آپ سمجھے کہ یہ "جدید نظام مذہبی" کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ یہ اشارہ اکبر کے دینِ الٰہی کی طرف ہے۔ کتنا مختصر اشارہ ہے، مگر "توہم پرست مسلمان" ـــــ مجموعۂ ضدّین ـــــ کی معراج تخیل کو کتنی صاف روشنی میں پیش کرتا ہے ـــــ اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلا دور ہے جس میں سیاسی اغراض پر مذہب کو قربان کرنے کی ابتدا ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تذکرہ میں اس نامبارک دور کے جو حالات بیان فرمائے ہیں ان کو پڑھیے تو آپ کو اس کی فتنہ سامانیوں کا اندازہ ہوگا۔ یہ پہلا فتنہ عظیم تھا جس نے پوری

طاقت کے ساتھ الحاد و بے دینی پھیلا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وطنی قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی۔ اُس دور کے تمام صلحاءِ امت اس فتنے پر چیخ اٹھے تھے۔ حضرت سید احمد مجدد سرہندی رحمۃ اللہ نے اسی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا۔ اسی ناپاک دور کے اثرات تھے جنہوں نے داراشکوہ کی صورت میں جنم لیا۔ اسی زہر کو دور کرنے کے لیے عالمگیر پچاس برس جد و جہد کرتا رہا اور یہی زہر آخر کار مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو گھن کی طرح کھا گیا۔ مسلمانوں میں قوم پرستی کی جدید تحریک دراصل اسی پرانی تحریک کی نشأۃ ثانیہ ہے، لہٰذا یہ لوگ اس فتنۂ عظیم کو فتنے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خیر القرون" کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور وسوسہ (Inspiration) حاصل کرنے کے لیے اُسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک متحدہ قومیت کی آفرینش کا یہ پہلا تجربہ، ہندوستانی مسلمان کی "خدمات" میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ ان کے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا تصور یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی قسمتوں کو اسی طرح اہلِ ملک کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ کرلیں۔

پنڈت جواہر لال بھی اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں فرماتے ہیں:-

"سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ کیا ہم اس سمت میں قدم اٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی مع تمام لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جس میں ایک سے زیادہ "اقوام" بستی ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر قوم "علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند (COMMAN WEALTH) میں صرف انسانی اور مادّی امداد کیا کرے؟ اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اس وقت تک کی کوششیں اس کے برعکس

> بالکل ناکام رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔
>
> لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی تب تو ہمیں عزم و استقلال کے ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیے بلکہ ہمارے پیشے اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیے۔ بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کے لیے ایک مضرت ہے لیکن اس کا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اور چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کرنا چاہیے۔

یہاں مافی الضمیر بالکل واضح ہوگیا ہے۔ صوبۂ بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی قسمتیں جس شخص کے ساتھ وابستہ ہیں، جسے بہار کی وزارت میں ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم کا نگران بنایا گیا ہے، وہ سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مستقل "قومیت" باقی رہے، اور آزاد ہندوستان میں ان کو ایک ممتاز اجتماعی وجود کی حیثیت سے اپنے مسائل خود حل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ اس کا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف اور جواہر لال نہرو کے نصب العین سے بالکل متحد ہے۔ ہم آزادی اس لیے چاہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس کے غیر مسلم اقتدار نے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کرسکیں۔ اور وہ آزادی اس لیے چاہتا ہے کہ اب تک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے، آگے چل کر وہ اپنے طبعی نتیجہ کو پہنچ جائے، یعنی ہماری مضمحل شدہ قومیت ہندوستان کی مشترک قومیت میں جذب ہو جائے، ہماری تہذیب کی کوئی امتیازی شان باقی نہ رہے، ہمارے مختلف پیشوں کے لوگ اپنے اپنے ہم پیشہ غیر مسلموں کے ساتھ گھل مل جائیں اور ان کے درمیان پیشوں کے ساتھ "رسوم میں بھی یکسانیت" پیدا ہو جائے۔ ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیے لفظ "اقوام" کا استعمال ہی فاضل ڈاکٹر کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ وہ ہندوستان کو ایک جغرافی نام نہیں بلکہ ایک قومی وحدت بنانا چاہتے

ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ ہند کا یہ حل بالکل غلط ہے کہ "ہر قوم علٰحدہ علٰحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند میں صرف انسانی اور مادّی امداد کرے"۔ برعکس اس کے صحیح حل یہ ہے کہ "مسلمان اسی راستہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی"، یعنی ہندوستان کی کان نمک میں نمک بننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو کیوں کرنا چاہیے؟ خدا اور رسول کی خاطر نہیں، بلکہ ملک کی خاطر ـــــ اور اپنی خاطر ـــــ غالباً یہاں "اپنے پیٹ کی خاطر" لکھنے میں ڈاکٹر صاحب کو شرم محسوس ہوئی ہوگی۔ این ہم غنیمت است!

کیا جواہر لال نہرو کا تصور قومیت اس سے کچھ بھی مختلف ہے؟

مسلمانوں کو اپنے نام "مسلم" پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام، اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت وافتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ مگر ڈاکٹر سید محمود صاحب کے نزدیک اس علٰحدہ نام سے مسلمانوں کا موسوم ہونا قابل اعتراض ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور اس قسم کے دوسرے تمام اسماء ان کے نزدیک محو ہو جانے چاہییں اور صرف ایک نام "ہندی" تمام باشندگان ہند کے لیے استعمال ہونا چاہیے تاکہ جداگانہ قومیتوں کا احساس ہی باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:-

"لفظ "ہندی" کو زبان کے لیے نہیں بلکہ "اہل ہند" کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برّاعظم کی علٰحدہ علٰحدہ "مذہبی اقوام" ہیں۔ اسی لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں"۔

"ہم علٰحدہ علٰحدہ مذہبی اقوام ہیں"۔ یہ گویا ہمارے دامن پر ایک شرمناک دھبہ ہے جسے مٹا دینے کی

ضرورت ہے! وہ دماغی کیفیت ہی لائق صد شرم و ندامت ہے جس کے تحت دنیا کے اس اکیلے ملک ہندوستان دو زخ نشان کے باشندے مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں!! یہ ثابت ہوجانا کہ ہم اس برِ اعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں، گویا اس بات کا ثابت ہوجانا ہے کہ ہم دورِ وحشت کی یادگار ہیں، اور اس تلخ حقیقت کو شیرینی یا کم از کم فریب شیرینی سے بدل دینے کے لیے اب ناگزیر ہوگیا ہے کہ ہم ان ناموں کو بدل ڈالیں جو "علیحدہ مذہبی اقوام" ہونے کے احساس کو زندہ رکھتے ہیں —— یہ ہیں اُس زعیم قوم کے خیالات جس کو مولانا ابو الکلام آزاد نے صوبۂ بہار کی وزارت میں ۴۰ لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے منتخب فرمایا ہے[1]، اور جو بجنور کی انتخابی مہم میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے مولٰنا حسین احمد صاحب کے ساتھ دوش بدوش کام کرتا نظر آتا ہے۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم میں کہ اصل محرومی آنکھوں کا بصارت سے محروم ہوجانا نہیں ہے بلکہ ان دلوں کا بصیرت سے محروم ہوجانا ہے جو سینوں میں پوشیدہ ہیں فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ۔

جو لوگ جناح کی فرنگیت اور بے دینی پر بڑھ بڑھ کر اعتراض کرتے ہیں ان کے جوش دینداری کو دیکھ کر ہماری زبان سے بے اختیار مرحبا نکلتی ہے۔ مگر جب اسی لمحہ میں وہ اِن خیالات کی تبلیغ کرنے والوں کے ساتھ اشتراک عمل کرتے نظر آتے ہیں، اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے باوجود جناح پر طعن کرتے ہوئے انھیں شرم بھی نہیں آتی تو ہم حیران ہوکر پوچھتے ہیں کہ یارب! یہ کیا تماشا ہے؟ یہ دینداری ہے یا سیاسی دھڑے بندی اور عصبیت جاہلیت؟ جناح فرنگی اور بے دین ہی

[1] اس موقع پر مولانا ابو الکلام کے تذکرہ میں ان علماء و مشائخ کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جنہوں نے دور اکبری میں سیاسی اغراض پر دین کی قربانی چڑھانے والوں کے ساتھ مداہنت برتی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق مولٰنا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ انشاء اللہ ازدیاد بصیرت کے موجب ہوں گے۔

مگر کُونُوا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا کی آواز تو بلند کر رہا ہے۔ اس کو تو مطعون کیا جاتا ہے محض اس بنا پر کہ نہ اس کی صورت اسلامی ہے نہ سیرت اسلامی۔ مگر یہاں سیرت و صورت دونوں غیر اسلامی ہیں اور اُس کے ساتھ یہ صدا بھی بلند کی جا رہی ہے کہ تعالوا الی کلمۃ سواءٍ بیننا وبین الکفار والمشرکین۔ یہاں عود الی الجاھلیۃ الاُولیٰ کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اور سیاسی اغراض کے لیے ملت ابراہیمی کا نام تک مٹا دینے کی فکر ہے۔ اس کے باوجود آزادی ہند کے ان داعیوں کے ساتھ اشتراک عمل کیا جاتا ہے اور ان کا اعتبار مسلمانوں میں قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ یہ انگریزی اقتدار کی جڑ کھودنے سے پہلے محمد رسول اللہ کے نخل آرزو کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں!

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

یہ تو صرف ایک نظیر تھی کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بس یہ ایک ہی نظیر ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حال ہی میں ایک مستقل شعبۂ اسلامیات قائم کیا ہے جس کے کارکن مسلمان ہیں، اور نشر و اشاعت کے آلۂ کار سب کے سب مسلمان اخبارات ہیں۔ مسلمانوں کے لیے کانگریس نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی فہرست میں اس شعبۂ اسلامیات کے قیام کو بھی ایک نمایاں جگہ دی جاتی ہے، چنانچہ جمعیت علماءِ ہند کا واحد ترجمان "الجمعیت" اس خدمت جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"دورِ جدید میں مسلمانوں نے شکایت کی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اسلامی جرائد نے اس شکایت کو پیش کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی معقولیت کو تسلیم کیا اور محض مسلمانوں کی دل دہی اور سہولت کار کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے

ماتحت اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ کھول دیا" (الجمعیۃ مورخہ ۵ رمضان ۵۶ھ)۔

بیچارے ناواقف عوام جب ان الفاظ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیسی مہربان ہے یہ کانگرس! اس نے آج تک کوئی شعبۂ ہندویات وسکھیات و پارسیات نہیں کھولا، مگر ہماری "دلدہی" اس کو یہاں تک منظور ہے کہ خاص ہمارے لیے ایک شعبۂ اسلامیات کھول دیا۔

اب ذرا اس شعبہ کی کارگذاری ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب (معتمد شعبۂ اسلامیات) کا ایک مضمون الجمعیۃ ہی میں ۱۸ رجب ۵۶ھ کی اشاعت میں درج ہوا ہے، اور ادارہ کی جانب سے اس پر کوئی تردیدی نوٹ یا اختلافی اشارہ تک نہیں ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

"ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی حالات اس درجہ ترقی کر گئے ہیں اور فضا کا تقاضا اس درجہ شدید اور انقلاب انگیز ہے کہ رجعت پسندوں اور سامراج پرستوں کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ علانیہ کانگریس یا آزادی کی جدوجہد کی مخالفت کریں اس لیے ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتیں اور سامراج کی حامی جماعتیں کسی تعصب کی آڑ لیتی ہیں۔ گذشتہ سات آٹھ سال میں جب کبھی سیاسی یا سماجی ترقی کے لیے قدم بڑھایا گیا، ہندو مسلم سوال ضرور چھیڑ دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ابتدائی تعلیم کے متعلق کانگریسیوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں ایک زمانہ میں سوال چھیڑا تو رجعت پسند مسلمانوں نے فوراً مذہبی تعلیم و تربیت کا سوال شروع کر دیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے لوگ اس موقع پر کونسل چھوڑ کر چل دیے۔ ساردا ایکٹ کے خلاف جو ہندو اور مسلمان قدامت پسندوں نے ہنگامہ کیا وہ سب کو معلوم ہے..... ترقی پسندی کی طرح رجعت پسندی بھی ہماری پبلک زندگی کے ہر پہلو پر

محاذ قائم کرنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بوسیدہ خود فنا نہیں ہوتا۔ بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد اسے معزول کر دیتی ہیں"۔

غور فرمائیے مسلمان بچوں کے لیے تعلیم کی کسی اسکیم میں مذہبی تعلیم و تربیت کا مطالبہ کرنا رجعت پسندی ہے، سامراج کی حمایت ہے، ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتوں کا کام ہے۔ فضا کا انقلاب انگیز تقاضا اب یہ ہے کہ اس "بوسیدہ" چیز کو بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد معزول کر دیں۔ اور یہ ساردا ایکٹ کا تذکرہ اس سلسلہ میں کتنا برمحل آیا ہے۔ اگرچہ اس "ترقی پسند" قانون کی مخالفت "الجمعیۃ" نے اس وقت کی تھی جب اس کا ایڈیٹر ایک "رجعت پسند" شخص تھا، مگر اس رجعت پسندی میں خود جناب مولانا کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب اور تمام ارکان جمعیت علماء ہند (یعنی اِس وقت جو حضرات فضا کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں سے متاثر ہو کر "ترقی پسند" بن گئے ہیں) اس کے ہم نوا تھے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب یہ بحث شروع کرتے ہیں کہ کانگریس کی شرکت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کا سوال جو اٹھایا جا رہا ہے، یہ دراصل ترقی پسند اور انحطاط پذیر قوتوں کی کشمکش کا ایک عکس ہے ـــ "ترقی پسند" اور "انحطاط پذیر"، ان دو اصطلاحوں کا مفہوم جواہر لال اور ان کے شعبۂ اسلامیات کی لغت میں جو کچھ ہے اس کی تشریح میں بعد میں عرض کروں گا ـــ یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "ترقی پسند" قوتیں اسلامی تہذیب کے سوال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ مسلمان ایک مخصوص تہذیب کے حامل رہے ہیں۔ باوجود اختلافات اور تنوع کے ان میں ایک قسم کی یگانگت اور یکسانیت پائی گئی ہے ـ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں کی زبان ایک تھی یا تمدن کے مظاہر ایک سے تھے، لیکن تاریخی طور پر کسی حد تک

صحیح ہے کہ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات ایک سمت کی طرف دکھائی پڑتے ہیں۔ لوگ اسلامی تہذیب پر بحث کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تمدن اور تہذیب نے ایک خاص ماحول میں تربیت پائی تھی اور بہرصورت مسلمانوں کی حکمران حیثیت سے وابستہ تھی۔ جو لوگ بے صبری کے ساتھ اسلامی تہذیب کی خصوصیات گناتے وقت یہ حدیث سناتے ہیں کہ کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہٖ۔ وہ اکثر یہ واقعہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حدیث یا اس قسم کے دوسرے اقوال اس زمانہ کے سماجی حالات کا عکس ہیں جب انسانوں کی تقسیم حاکم اور محکوم، راعی اور رعیت میں ہوتی تھی اور مسلمان من حیث القوم حکمران تھے۔.........

البتہ اسلامی تمدن اور تہذیب کا مفہوم اس درجہ محدود نہ تھا جیسا آج کل ہوگیا ہے آج اسلامی تہذیب کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر مسلمان بجائے کلاہ اور عمامہ کے گاندھی ٹوپی پہننے لگتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے پرچار کے لیے دو چار منہ وا اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا لباس اگر نہ پہنیے یا اگر فصیح و بلیغ اردو نہ بولیے تو آپ کا تمدنی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی مسلمان رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معیاری اور ٹکسالی مسلمان صرف وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو دلی اور لکھنو کی فضا میں پلے اور بڑھے ہیں (چاہے وہ کایستھ یا کشمیری برہمن ہی کیوں نہ ہوں) یا پھر دیوبند اور فرنگی محل کا لباس پہننے والے اور علماء کی وضع کے پابند لوگ"۔

دیکھا آپ نے "ترقی پسندوں" کے علم و فضل اور ان کی دانش و بینش کا معیار کس قدر بلند ہے! ان کے ارشادات جب ہم پڑھتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے پنڈت جواہر لال نہرو نے

اپنی آواز کو ایک ریکارڈ میں بھروا دیا ہے، اور وہی ریکارڈ جگہ جگہ بجتا پھر رہا ہے۔ اپنے شیخ طریقت، پنڈت جواہر لال کی طرح یہ لوگ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے پر اظہار خیال کر کے درحقیقت اپنی بے علمی کا راز فاش کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نابلد نہیں ہیں بلکہ نفس تہذیب و تمدن کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں ـــ یا اگر ناآشنا نہیں ہیں تو عمداً خلط مبحث کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا، حکمران طبقے کے آداب و اطوار کا، لباس کی وضعوں اور کھانوں اور مٹھائیوں کا، اور اظہار مافی الضمیر کے وسائل کا۔ پھر ان تمدنی مظاہر میں گردش ایام کے ساتھ جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کے درمیان یہ کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کونسے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کونسے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھ کر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو، تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بارہا بدل چکا ہے، اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے، لہٰذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے جس طرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی اُن تغیرات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ جن کا تقاضا، فصحا کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظ دیگر جواہر لال اور ان کی امت کے رجحانات کر رہے ہیں ـــ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں رہتا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کے لیے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اُس طرز فکر، اُس نظریۂ حیات، اور اُس معیار امتیاز و

انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتد بہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے، اور جس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اُس خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے اصول و قواعد کے مطابق اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علمار کا لباس نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس ذہنیت اس طرز خیال اور ان اصول حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرت رسول سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر رہے، وہ اسلامی تمدن ہے، خواہ اس کی زبان، اس کے آداب واطوار، اسکے کھانوں اور مٹھائیوں اور اس کے لباس و طرز معاشرت میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدن کو اسلامی تہذیب کے وائرے سے خارج نہیں کر دیتا، البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لیے کوئی سند جواز نہ ہو، تو یقیناً وہ تمدن کو غیر اسلامی تمدن بنانے کا سبب ہوگا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لے کر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں مگر ان سب میں ستر عورت کے انہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دیئے ہیں۔ لہٰذا یہ سب لباس اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدن ہی کے لباس کہے جائیں گے۔ مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہوگا تو ہم اسے غیر اسلامی لباس کہیں گے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے جو حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کیے ہیں ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں ان کی نوعیتیں کتنی ہی بدل جائیں، اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما ہو جائے ان سب کو اسلامی تمدن ہی کے دائرہ میں جگہ ملے گی، البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدود حلت سے متجاوز ہو گی تو ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجیے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور ان کے یہ مسلمان متبعین اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے کو

کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو اور خود ناواقف مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دورِ حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہوگئے تھے انہی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن رکھ دیا گیا ہے، اور جو مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں، ان کا مقصد محض اُس گزرے ہوئے تاریخی دور کی میراث کو اِس بدلے ہوئے زمانہ میں جوں کا توں برقرار رکھنا ہے، اس لیے یہ رجعت پسند اور ترقی دشمن ہیں۔ ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی غلط ترجمانی شاید ایسی بے حیائی کے ساتھ تو یورپ کے سیاسی بازی گروں نے بھی نہ کی تھی، جیسی کہ یہ ہمارے ہم وطن اور ہم قوم کر رہے ہیں۔ ان کو اگر معلوم نہیں ہے تو ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اُس تمدن کی حفاظت کے لیے نہیں اٹھے ہیں جو کسی زمانہ میں حکمراں طبقہ کے رجحانات سے پیدا ہوا تھا، بلکہ ہم اس لیے اٹھے ہیں کہ ہماری قوم کا تمدنی ارتقاء قرآنی تہذیب کے راستہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔ ہمیں دلّی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کو بچانے کی فکر نہیں ہے، بلکہ اُس ذہن کو اسلامی ذہن رکھنے کی فکر ہے جس نے اپنی شخصیت ظاہر کرنے کے لیے اس زبان کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم دیوبند اور فرنگی محل کے لباس محفوظ رکھنے کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ ہم اس لیے لڑنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں اُس لباسِ حیا سے خارج نہ ہو جائیں جو اسلامی تہذیب نے انہیں پہنایا ہے۔ اور اس لڑائی کی ضرورت ہمیں اسلیے پیش آئی ہے کہ ہم ہندوستان کی سیاست پر تم جیسے لوگوں کو غالب آتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہماری تہذیب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں، جن میں اتنی راست بازی و انصاف پسندی نہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور جن میں ان کمزوریوں کے ساتھ ہٹلر اور موسولینی کی فاشسٹی روح گھس گئی ہے کہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے کسی طاقت کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے خواہ اس کے استعمال میں صداقت، انسانیت اور اخلاق کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

خیر یہ ایک ضمنی بحث تھی۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کانگریس کا یہ شعبہ اسلامیات جو ہماری "دلدہی" اور "سہولت کار" کے لیے قائم کیا گیا ہے، دراصل کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے مختصر نظریات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں ان کو مسلمان مضمون نگاروں اور مسلمان اخباروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں آتارنا اس کا مقصد ہے، اور آپنے دیکھ لیا کہ یہ شعبہ جو ہماری "دلدہی" کے لیے قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو کس خوبی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ وہ ہمیں یہ سمجھا رہا ہے کہ یہ تہذیب جس کی حفاظت کا تم دعویٰ کر رہے ہو، کوئی چیز بھی تو نہیں ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات تھے سو وہ طبقہ ہی ختم ہو گیا۔ ایک خاص ماحول میں اس تہذیب نے تربیت پائی تھی، سو وہ ماحول ہی اب باقی نہیں۔ اب لے دے کے تمہاری تہذیب یہ رہ گئی ہے کہ ایک خاص وضع کا لباس پہن لیتے ہو اور ٹکسالی اردو بول لیتے ہو، تو وہ بھی دلی اور لکھنؤ تک محدود ہے اور دلی و لکھنؤ میں بھی وہ کوئی خاص تمہاری چیز نہیں ہے بلکہ کایستھ اور کشمیری برہمن بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ کیا اسی مہمل چیز کو تم فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں اور سیاسی و اقتصادی حالات کی ترقی کے مقابلے میں بچانا چاہتے ہو؟ یہ تو عین رجعت پسندی ہے کیونکہ وہ دور گذر چکا جس میں یہ تہذیب پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ سامراج پرستی بھی ہے کیونکہ فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں کے مقابلہ میں اس بوسیدہ چیز کی حفاظت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم سامراج کی حمایت کرو اور سامراج تمہاری حمایت کرے!

مسلمانوں کو شکایت تھی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اس شکایت کی معقولیت تسلیم کر کے کانگریس نے کیسے معقول طریقہ سے اسے دور کیا ہے!

ڈاکٹر اشرف صاحب کا وعظ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے سنیے:۔

"جاگیرداروں اور عہد بادشاہت کے زمانہ میں باعتبار زبان، لباس، تمدن بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ عربی، فارسی، ترکی، تاتاری، چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی، ہر طرح کے لباس مسلمانوں کے ہر طبقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلا وطن ہو کر ایران پہونچا تو شاہ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کے لیے خاص طور پر ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے۔ عقائد کی یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں، بہتر فرقے ضرب المثل ہیں"۔

کچھ غور بھی کیا آپ نے کہ یہ تنوع کی تمام مثالیں کس مقصد کے لیے پیش کی جارہی ہیں؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زبانیں بول کر، اتنے مختلف لباس پہنکر، ایران میں ہندوستانی مٹھائی کھا کر، بہتر فرقوں میں بٹ کر، اور عقائد میں یکسانیت سے یکسر محروم ہو کر بھی تم مسلمان رہے تو اب اگر تم گاندھی کیپ اور دھوتی پہن لو، تمہاری عورتیں سماجی خدمت (Social Service) کے لیے گھروں سے باہر نکل آئیں، تم نئی "ہندوستانی" زبان بولنی اور لکھنی شروع کردو، مخلوط تعلیم گاہوں میں تمہارے لڑکے اور تمہاری لڑکیاں "جدید طرز کی تعلیم" حاصل کرنے لگیں، سیاسی معاشرتی اور معاشی انقلاب کی جدید تحریکات تم میں پھیلنے لگیں تو اس میں کونسا مضایقہ ہو جائیگا؟ —— اسی مقصد کو چھپا کر ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"اس اعتبار سے آج ہم ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جد و جہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس نئی تاریخی منزل اور اس کے تقاضے سے باخبر ہوں"۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ ساری دماغ سوزی اُس سماجی انقلاب (Social Revolution)

کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر کی گئی ہے جس کا نقشہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ دعوت پھیلائی کس اخبار کے ذریعہ سے جا رہی ہے؟ اس اخبار کے ذریعہ سے جو جمعیت علماء ہند کا واحد ترجمان ہے۔ کیسے صحیح راستہ پر جا رہی ہے "یہ آزادی کی فوج"! شردھانند کی شدھی پر شور قیامت برپا تھا۔ جواہر لال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اتاری جا رہی ہے۔

"آزادی کی فوج" اپنے مسلمان سپاہیوں سے جو خدمت لے رہی ہے ان میں سے دو صاحبوں کے کارنامے آپ نے ملاحظہ فرما لیے۔ ایک صاحب نے اسلامی قومیت پر تیشہ چلایا۔ دوسرے صاحب نے اسلامی تہذیب و تمدن پر ضرب لگائی۔ اب تیسرے سپاہی کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔

اخبار "مدینہ" میں اسی "شعبۂ اسلامیات" کے ایک ذمہ دار رکن جناب منظر رضوی صاحب کا ایک طویل مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس پر اختلافی نوٹ کے بجائے ادارہ مدینہ کی جانب سے حسب ذیل تعریفی نوٹ لکھا گیا ہے:۔

"فاضل مقالہ نگار نے جس خوبی کے ساتھ اسلامیان ہند کے سامنے مسائل حاضرہ کو پیش کیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ قارئین مدینہ اس مقالہ کو صبر و سکون کے ساتھ از اول تا آخر مطالعہ فرمائیں۔" ("مدینہ" مورخہ یکم نومبر ۳۷ء)

اب ذرا دیکھیے کہ کس خوبی کے ساتھ اسلامیان ہند کو مسائل حاضرہ سمجھائے جاتے ہیں

"ہمارا دوسرا حربہ حکومت اور اس کے حاشیہ بردار زمینداروں، تعلقداروں، جاگیرداروں کی مالگذاری اور لگان بند کرنا ہے ...... لیکن یہ یاد رہے کہ ان پایوں کو گراتے وقت ایک بہت بڑی کرانتی (انقلاب) مچیگی۔ بلوے اور فساد ہوں گے۔ اس میں خونریزیاں بھی ہوں گی۔ خون کی ندیاں بہیں گی اور سب کچھ ہوگا۔ اور اس وقت یہ جتنے زمیندار، سرمایہ دار،

پونجی اور کانوں کے مالک، تعلقوں اور جاگیروں کے آقا، یہی راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، سر سکندر حیات، راجہ نریندر ناتھ، گھنشام داس برلا، بھائی پرمانند، اور سیٹھ والمیا جو مسلم ملت اور ہندو جاتی کے نعرے لگائے جاتے ہیں اپنی اپنی غریب اور دکھی جنتا اور غریب اور فاقہ مست عوام کو چھوڑ کر برٹش سامراج کے ساتھ ہوں گے اور ان پر گولے اور بم برسائیں گے۔ دوسری طرف غریبوں کی طاقت ہوگی اور اُن کی جیون ساتھی کانگریس"۔

"ہماری آنے والی لڑائی دراصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔ اس میں ہندوستان بھر کے امیر چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے کے کیوں نہ ہوں بدیسی سامراج کے ساتھ ہوں گے اور وہ ہم غریبوں اور مفلسوں کو توڑنے اور تباہ کرنے کے لیے ہر ہتھیار کو استعمال کریں گے"

...... پھر کسانوں اور مزدوروں کی جاگ سے امیروں کو، راجہ محمود آباد، نواب چھتاری اور سر سکندر جیسے لوگوں کو بہت بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ پلٹا کھانے کو ہے۔ دولت اور امیری ہاتھ سے نکلنے کو ہے، امیروں کو نیچے آنا ہے۔ غریبوں کو اوپر جانا ہے۔ ان سب باتوں کے ڈر سے ہندو جاتی اور مسلم ملت کے یہ ہندو مسلم نام لیوا اپنے اپنے مذہب کے لوگوں کو سامراج مخالف تحریک سے ہٹا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لوگ مل کر آخری لڑائی نہ لڑنے پائیں۔ اس لیے قرآن اور حدیث کی آیتیں اور وید اور شاستر کے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں"۔

جنگ آزادی کی نوعیت کو اس طرح واضح کرنے کے بعد فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں:۔

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانو ملجاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ اس کا مقصد کیا؟ جہاں تک توحید، رسالت، مذہبی معتقدات، اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے وہ آپس میں

ملے ہوئے ہیں۔ بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لیے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔ وہ ہرگز متحد نہیں ہوسکتے اور نہ ان کو متحد ہونا چاہیے مسلمانوں کے اغراض اور فائدے بالکل ایک سے نہیں ہیں۔"

"ہندوستان میں امیر اور غریب کے دو طبقے ہیں۔ امیروں کی غرض یہ ہے کہ امیری کے جتنے بھی وسائل ہیں ان پر ان لوگوں کا قبضہ رہے۔ اور غریبوں کی محنت سے وہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ غریبوں کا فائدہ اس میں ہے کہ امیری کے یہ وسیلے ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور ان کا انتظام اس طرح ہو کہ ملک سے غربت دور ہو۔ غربت کو دور کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ دولت کے ان محدود دہیلوؤں کو ان کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ شخصی ملکیت کو ختم کیا جائے۔ ...... یہ عام اور اصولی بات ہے۔ اب ہندوستان کے آٹھ کرور مسلمانوں کا فائدہ کیا ہے؟ مسلمانوں میں بھی کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب سب کی ایک ہی حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تھوڑے سے لوگ امیر ہیں۔ جو شاید زیادہ سے زیادہ ایک کرور ہوں گے۔ سات کرور مسلمان محنت سے روٹی حاصل کرتے ہیں۔ ...

... جب تک پونجی شاہی دولت کی پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو ہم متذکرہ بالا انقلابات سے غارت نہیں کرتے ان کے روزگار کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا۔ .... اس کے خلاف وہ ایک کرور مسلمان بھی ہیں جن کے پاس زمین، جائداد، کارخانے اور دکان ہیں۔ ان کی جیبوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں ہیں۔ وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ اب ان سات کرور غریب مسلمانوں کو ایک کرور امیر مسلمانوں سے ملنے کے لیے کہا جاتا ہے"۔

"خیر" تو عام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں خود مسلم ملت کے حقوق و مفاد باہم دگر متضاد اور مختلف ہیں ان میں کوئی یگانگت نہیں.. ...... مختصر یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں"

فی الواقع مسائل حاضرہ کو ان سطور میں "بڑی خوبی" کے ساتھ پیش کیا گیا ہے! مگر ایسی خوبی کے ساتھ ان مسائل کو صرف وہی لوگ پیش کر سکتے ہیں اور ایسی گرمجوشی کے ساتھ ان کی داد بھی وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھیں تعلیم قرآن کی ہوا تک نہ لگی ہو، یا جنہوں نے اِتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا کے مصداق قرآن حکیم کو ایک دوراز کار شے سمجھ کر بالائے طاق رکھ دیا ہو۔

انگریزی سامراج کے مقابلہ میں ان لوگوں کا نقشۂ جنگ خود انہی کی زبان سے آپ نے سن لیا۔ یہ چاہتے ہیں کہ اس سامراج کے قلعے کو ڈھانے کے لیے اشتراکی انقلاب برپا کریں۔ اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے نادار لوگوں کو بلا امتیاز دین و ملت ایک گروہ بنایا جائے، اور مالدار لوگوں کو بلا امتیاز دین و ملت ایک دوسرا گروہ بننے پر مجبور کیا جائے۔ پھر پہلے گروہ میں دوسرے گروہ کے خلاف نفرت، حسد، اور بغض کی اتنی آگ پھونکی جائے کہ وہ کرانتی مچانے اور لوٹ مار کا بازار گرم کرنے اور خون کی ندیاں بہانے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ کام جب پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا، اور اس قسم کی کرانتی سارے ہندوستان میں مچ جائے گی، تب کہیں سامراج کا قلعہ منہدم ہو گا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں تب وہ ہتھیار تیار ہو گا جس سے یہ حضرات اس قلعے کی جڑوں پر ضرب لگانا چاہتے ہیں — اب اگر آپ اسلام کی حقیقت سے واقف ہیں اور امت مسلمہ کے نظام ترکیبی کو تھوڑا بہت بھی جانتے ہیں تو یہ سمجھنا آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ اس طریق جنگ سے سامراج کا استیصال تو بعد میں ہوتا رہے گا، پہلے تو اسلام کا استیصال بحیثیت ایک نظام اجتماعی کے، اور امت مسلمہ کا استیصال بحیثیت ایک قوم کے

مکمل ہوجائے گا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو حقیقت سے قریب تر ہوگا کہ جس ہتھیار سے یہ لوگ انگریزی سامراج کا قلعہ ڈھانا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک تیار ہی نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسلام کے قصر کو مسمار کرکے اس کا مسالہ اس ہتھیار کی تیاری میں صرف نہ کردیا جائے۔

پنڈت جواہرلال کے جو خیالات آپ ماہ رمضان کے "اشارات" میں پڑھ چکے ہیں انھیں سامنے رکھیے اور اس کے بعد ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر اشرف اور منظر رضوی صاحبان کے ان ارشادات کو علی الترتیب پڑھیے تب آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ آزادی کی فوج کس طرح بنائی جارہی ہے، کس طرح اس کی تشکیل میں خود مسلمانوں سے کام لیا جارہا ہے اور اس کے کیا نتائج مسلمانوں پر مترتب ہونے والے ہیں۔

ان کا پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دماغ سے اسلامی قومیت کا خیال نکال دیں۔ یہ ہندوستان کی تمام آبادی کو "ایک قوم" بنانا چاہتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کی مستقل قومیت کو فنا کردینا ان کے نزدیک ہندوستان جدید کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔

ان کا دوسرا حملہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ سب ایک تہذیب اور ایک تمدن کو اختیار نہ کرلیں۔ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب ہے۔ اسی کو دور کرنے کے لیے کہا جارہا ہے اور خود مسلمانوں کی زبان سے کہلوایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی کوئی علیٰحدہ تہذیب ہے ہی نہیں۔ تمدن کی مختلف صورتیں وہ ہمیشہ اختیار کرتے رہے ہیں، اور اب اُس صورت کو بھی قبول کرلینے میں کوئی حرج نہیں جو "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے پیدا ہورہی ہے۔

ان کا تیسرا حملہ اسلام کے نظام اجتماعی پر ہے اور یہ سب سے زیادہ خطرناک حملہ ہے کیونکہ یہی حملہ مسلمانوں کو قرآنی مذہب کے دائرے سے نکال کر اشتراکی مذہب میں شامل کردیتا ہے مسلمانوں کی

عظیم اکثریت بھوک اور افلاس میں مبتلا ہے اور اس کے ساتھ اپنے مذہب سے جاہل بھی ہے۔ اس انبوہ کثیر میں اگرچہ اتنی عقل ضرور ہے کہ اگر اس سے علانیہ تبدیل مذہب کے لیے کہا جائے تو شائد وہ مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہو جائے، مگر اتنے ہوشمند یہ لوگ نہیں ہیں کہ اشتراکیت کے نتائج کو سمجھ سکیں۔ ان کے سامنے جب یہ کہا جائیگا کہ آؤ ہم تمہاری بھوک کے مسئلے کو حل کیے دیتے ہیں، تو یہ بیچارے ٹڈی دل کی طرح اُس مسلک کی طرف ٹوٹ پڑیں گے جس میں ان کو پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان نظر آئے گا۔ یہاں ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے اصلی بھائی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو تمہاری طرح بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہیں، اور تمہارے اصلی دشمن وہ مسلمان ہیں جو کسی زمین یا مکان یا کارخانے کے مالک ہیں، یا جن کے پاس تم سے کچھ زیادہ وسائل معیشت موجود ہیں، آؤ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ ملکر ان مسلمان دشمنوں سے لڑو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سات کرور جاہل اور مفلس مسلمان، اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے اُن ایک کرور مسلمانوں سے نہ صرف علیحدہ بلکہ برسر جنگ ہو جائیں گے، جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو بہرحال کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہیں اور جن کے پاس کسی نہ کسی حد تک اسلامی شریعت کا علم محفوظ ہے (یہاں یہ یاد رہے کہ ان ایک کرور مسلمانوں میں سب کے سب تعلقدار اور جاگیردار، راجہ محمود آباد اور نواب چھتاری نہیں ہیں اور نہ سب بدیسی سامراج کے ساتھی ہیں بلکہ ان میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جیسے لوگ بھی ہیں اور ہمارے متوسط طبقے کی عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہے) اس قسم کی علیحدگی اور دشمنی پیدا ہو جانے کے بعد کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ ان دونوں طبقوں کے مسلمان مذہبی معتقدات اور مذہبی حرکت و عمل میں ایک دوسرے سے ملے رہیں۔ جن کے درمیان روٹی کی لڑائی چھڑ گئی ہو، کیا وہ مسجدوں میں مل کر نماز پڑھ سکتے ہیں؟ جن کے دلوں میں بغض و حسد کی آگ بھڑکا دی گئی ہو کیا وہ اپنے پیٹ کے دشمنوں کو اپنا دینی بھائی سمجھ سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مالدار مسلمان اپنے اس ہمسایہ کو زکوٰۃ دے جس کے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ اس کی جائداد لوٹنے کی فکر میں

لگا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مفلس طبقہ کے عوام، متوسط تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں سے اُس مذہب کے معتقدات اور احکام سن کر قبول کریں گے جو صاف طور پر شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، حلال طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کو کمانے والے کا حق قرار دیتا ہے، اور اس شخص کو مفسد اور ڈاکو سمجھتا ہے جو ایسی دولت کو چھیننے کے لیے ہاتھ بڑھائے؟ پس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے درمیان معاشی نزاع اور طبقات کی جنگ برپا ہو جانے کے بعد دینی اخوت کا رشتہ کسی طرح باقی ہی نہیں رہ سکتا، اور یہ رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد جو سات کروڑ جاہل مفلس مسلمان اپنے سے دوگنی ملکہ تگنی تعداد کے غیر مسلموں میں گھل مل جائیں گے جن میں یہ احساس پیدا کیا جائے گا کہ ان کے اصلی بھائی یہی غیر مسلم ہیں، اور جن کو اشتراکی اصول وعقائد کے مطابق ٹریننگ دی جائے گی اُنھیں کوئی چیز دائرۂ اسلام سے نکلنے اور غیر اسلامی قومیت میں جذب ہو جانے سے نہیں بچا سکتی۔

فرمائیے اس تحریک کو اگر میں "شدھی" سے تعبیر کرتا ہوں تو کیا غلطی کرتا ہوں۔ کیا فرق ہے اس شدھی میں اور شردھانند والی شدھی میں؟ مسلمان جب اسلام سے منحرف ہو گیا اور اسلامی قومیت سے نکل گیا تو ہمارے لیے یکساں ہے خواہ وہ ہندو مت میں جائے یا کسی اور مت میں۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ شردھانند کی شدھی ایک کھلی ہوئی چیز تھی، اس کا داعی صاف کہتا تھا کہ میں تمہیں اسلام سے نکالنا چاہتا ہوں، ہر وہ شخص اس سے بچ سکتا تھا جو کفر سے بچنا چاہتا ہو، اور کسی طرح یہ ممکن ہی نہ تھا کہ مسلمان اس شدھی میں خود مددگار بن جاتے۔ بخلاف اس کے یہ شدھی ایسی ہے کہ اس کا نام "آزادی کی جنگ" جیسا قابل عزت نام ہے۔ اس میں خود مسلمانوں سے، ان کے مقرروں سے، انشاپردازوں سے، لیڈروں سے، ایڈیٹروں سے، حتیٰ کہ ان کے علما تک سے حسب حیثیت کام لیا جا رہا ہے، اور ہزاروں مسلمان اس کی طرف بگٹٹ چلے جا رہے ہیں بغیر اس کے کہ انھیں اس امر کا شعور ہو کہ وہ دراصل شدھی کے

راستے پر جا رہے ہیں۔

یہ ہے اس جنگ آزادی کی حقیقت جس سے علیحدہ رہنے پر "قوم پرست" ہی نہیں بلکہ ہمارے "دین پرست" بھائی اور ہمارے دین کے علمبردار علماء تک مسلمانوں کو بزدلی اور ٹوڈیت اور سرکار پرستی کے طعنے دے رہے ہیں۔ ان حضرات پر کانگریسی پریس کے پروپیگنڈا اور جواہرلال کے مصنوعی الفاظ کا جادو چڑھ گیا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ "آزادی کی جنگ" فی نفسہ ایک مقدس جہاد ہے جس میں شریک ہونا ہر مسلمان کا "فرض" ہے ـــــ "فرض" کے لفظ کو یاد رکھیے کیونکہ مولانا ابوالکلام جیسے عالم دین نے فرائض کی فہرست میں اس نئے فرض کا اضافہ فرمایا ہے ـــــ حالانکہ درحقیقت یہ آزادی مسلمانوں کے لیے آزادی نہیں ہے، بلکہ ان کی قومیت، ان کی تہذیب اور ان کے نظام اجتماعی کی کامل بربادی ہے، اور اُس کام کی تکمیل ہے جسے ڈیڑھ سو برس پہلے انگریزی امپیریلزم نے شروع کیا تھا۔ ایسی آزادی کے لیے لڑنا ہرگز مسلمان کا فرض نہیں ہے۔ قرآن سے، حدیث سے، اور عقل سے، غرض کسی معیار حق و صداقت سے بھی اس احمقانہ فعل کو فرض ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ "فرض" تو درکنار، میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو ایسی جنگ سے دلچسپی یا ہمدردی رکھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ان پر دین اور عقل سلیم دونوں کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے قومی وجود اور اپنی تہذیب کو تباہی سے بچانے کے لیے اجتماعی جدوجہد اور سرفروشانہ جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔

آزادی کی یہ نام نہاد جنگ صرف انگریزی امپیریلزم ہی کے خلاف نہیں ہے جس کے ہم اور جواہرلال دونوں یکساں دشمن ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہ اُس قومیت، اس تہذیب اور اس نظام اجتماعی کے خلاف بھی جنگ ہے جس کو ہم دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جواہرلال اپنے ہندوستان

جدید کی تعمیر میں سد راہ سمجھتے ہیں۔ جواہر لال ہمارے اور اپنے مشترک دشمن سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں لیکن اس لڑائی کے لیے طریقہ وہ اختیار کرتے ہیں جو مشترک دشمن کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے خود ہمارا استیصال کر دیتا ہے۔ جب ایسی لڑائی میں ہم ان کے ساتھ شریک ہونے سے انکار کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ تم رجعت پسند ہو، ترقی دشمن ہو اور سامراج کے حامی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ترقی بس اُسی چیز کا نام ہے جسے جواہر لال ترقی کہتے ہیں، اور اس کی مخالفت کرنا رجعت پسندی ہے۔ سامراج کی جڑ کھودنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ اپنی جڑ بھی کھود ڈالیں، اور اس طریقہ سے انحراف کرنا گویا سامراج کی حمایت کرنا ہے۔ سامراج کو انہوں نے ہمارے لیے ایک ہوّا بنایا ہے جس سے ڈرا ڈرا کر وہ ہم کو اُس راستہ کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں جس میں ہماری ہستی ہی فنا ہو جاتی ہے۔ انہوں نے مصنوعی الفاظ، جھوٹے پروپیگنڈا، اور پرفریب مظاہرات کا ایک جال بچھایا ہے جو بدترین ذہنی استبداد کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ لوگوں پر اپنی مرضی کو جبراً مسلط کر رہے ہیں اور جو کوئی ان کے استبداد کی اطاعت کرنے سے انکار کرتا ہے اس پر اپنے بناوٹی الفاظ — رجعت پسندی، فرقہ پرستی، ترقی دشمنی اور سامراج پرستی — کی بارش کرتے ہیں تاکہ اس کی آواز بے اثر ہو جائے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو سامراج پرستی کے اصلی مجرم وہ خود ہیں، کیونکہ سامراج سے لڑنے کے لیے انہوں نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کو ہندوستان کی آبادی کسی طرح قبول نہیں کر سکتی۔ اس غلط اور احمقانہ طریقہ سے وہ خود سامراج کی مدد کر رہے ہیں اور پھر طعنہ ہم کو دیتے ہیں کہ تم سامراج کے حامی ہو، حالانکہ ہم سامراج کے حامی نہیں بلکہ شدید ترین دشمن ہیں مگر ایسے احمق دشمن نہیں کہ برائے شگون کے لیے اپنی ناک کاٹنے پر آمادہ ہو جائیں۔

مقالات

متاع کارواں

از "سار بان"

(۴)

اب لشکر آزادی کے سالار دوم (Second in Command) پنڈت جواہر لال نہرو کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔ اس سے پہلے آپ رسم الخط کے متعلق صاحب موصوف کی گراں قدر رائے پڑھ چکے ہیں۔ ان الفاظ کو پھر ایک مرتبہ دیکھ لیجیے اور اس کے بعد "میری کہانی" جلد دوم کا صفحہ ۲۰۰ کھول کر دیکھیے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ

"فارسی اور دیوناگری کے جھگڑے احمقانہ ہیں"۔

دوسرے الفاظ میں آپ کے نزدیک یہ فعل سراسر حماقت ہے کہ کوئی جماعت اپنی زبان کے اُس رسم الخط کی اہمیت پر زور دے جس کے بدل جانے سے خود پنڈت جی ہی کے الفاظ میں، یہ اندیشہ ہے کہ "الفاظ کی شکلیں بدل جائیں گی، آوازیں بدل جائیں گی، خیالات بدل جائیں گے، قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جائیگی اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جائیگا جو مردہ ہو چکی ہے"۔

رسم الخط جس کی اہمیت اتنی زیادہ تھی، اب اس کو اتنا غیر اہم قرار دینے کی کوشش کس لیے ہے؟ اس کی وجہ خود پنڈت جی بیان فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایک متحد قوم پیدا ہو"۔ (جامعہ مورخہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ صفحہ ۰ (۹)۔

اس بنا پر جو لوگ اپنی زبان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں وہ "فرقہ پرست" ہیں:۔

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور ہے، اور اس بنا پر (زبان میں) علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ برابر اپنا اثر دکھائے جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشوونما کے ساتھ یہ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائے گی۔ ...... ایک علیحدگی پسند حامی زبان کو اوپر سے کھرچو اور تم دیکھو گے کہ اندر سے وہ فرقہ پرست ہے بلکہ زیادہ تر تم اسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے" (یہ پنڈت جی کا ایک تازہ مضمون ہے جو ہندوستان کے اکثر اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے)۔

ان تصریحات سے آپ پنڈت جی کا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کو ایک قابل نفرت "فرقہ وارانہ مسئلہ" قرار دینا اور "سیاسی رجعت پسندی" سے موسوم کر کے اس کو اور زیادہ ذلیل بنانے کی کوشش کرنا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ پنڈت جی زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ نہیں۔ بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ اس کی اہمیت سے خوب واقف ہیں، اور اسی واقفیت کی بنا پر وہ اس کے خلاف اپنی مخصوص سیاسی زبان کے شدید ترین الفاظ ——"فرقہ پرستی"، "رجعت پسندی"، "سامراج پرستی" وغیرہ —— پورے زور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تاکہ اس گولہ باری سے یہ قلعہ کسی طرح منہدم ہو جائے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی ایک مخصوص قومی زبان کا محفوظ رہنا دراصل ان کی مخصوص قومیت کے محفوظ رہنے کا ہم معنی ہے۔ جب تک یہ زبان ایک علیحدہ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اور اس میں وہ الفاظ اور اسالیب بیان موجود ہیں جو اسلامی

ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس وقت تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کی مستقل قومی تہذیب فنا نہیں ہوسکتی، اور نہ وہ اس لٹریچر سے بیگانہ ہوسکتے ہیں جو ان کے ذہن میں اس قومیت اور اس تہذیب کی قدروقیمت پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری نہیں بلکہ کامل باخبری ہی ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ زبان میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو "فرقہ پرستی" جیسے گھناؤنے القاب سے یاد کرکے آزادی پسند مسلمانوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کریں، اس لیے کہ دراصل ان کا نصب العین ہندوستان کی تمام آبادی کو "ایک قوم" بنانا، اور جدا جدا قومیتوں کو فنا کردینا ہے۔ ان کے نزدیک "سیاسی رجعت پسندی" یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی قوم اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور "سیاسی ترقی پسندی" یہ ہے کہ سب قوموں کے لوگ اپنی اپنی قومیتوں کو چھوڑ کر اس "ایک قوم" میں جذب ہوجائیں جسے پنڈت جی وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کے لیے منجملہ دوسری تدابیر کے ایک یہ تدبیر بھی ضروری ہے کہ ایک "مشترک قومی زبان" پیدا کی جائے، اور ہر ایسی زبان کو مٹا دینے یا کم از کم مسخ کردینے کی کوشش کی جائے جو کسی قوم کی جداگانہ قومیت کو سہارا دیتی ہے۔

یہی نصب العین ہے جس کو پیش نظر رکھ کر "ہندوستانی زبان" کا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ آخری منزل مقصود پنڈت جی کے نزدیک بھی یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط دونوں میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو مٹا دیا جائے لیکن وہ اپنے ہم مشربوں سے زیادہ ہوشیار ہیں، اس لیے کہتے ہیں کہ تدریج کے ساتھ ایک ایک قدم بڑھاؤ۔ دفعتاً رسم الخط پر ہاتھ ڈالوگے تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لہٰذا سردست اس کی حفاظت کا اطمینان دلادو، اور پہلے الفاظ و اسالیب بیان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان دور کرنے کی کوشش کرو۔ جب اردو زبان عربی و فارسی الفاظ کے ذخیروں سے خالی ہوکر ہندی الفاظ سے بھرپور ہوجائیگی، جب ذخیرۂ الفاظ کے بدلنے سے اسالیب بیان، اور خود حقیقت بیان میں تغیر پیدا

ہوجائیگا، تو سمجھ لو کہ آدھا معرکہ سر ہوگیا۔ اس کے بعد دیکھیں گے مستقبل نے اگر کوئی مناسب موقع فراہم کردیا تو رسم الخط میں بھی "علیٰحدگی پسندی" کا رجحان مٹا دیا جائیگا، اور "مشترک قومی زبان" کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی ——— ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دانشمندانہ پالیسی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اسی بنا پر پنڈت جی فرماتے ہیں :—

"اس لیے دانشمندی کے ساتھ ہم نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں (رسم الخطوں) کو پوری آزادی حاصل رہے۔ اگرچہ یہ ان لوگوں پر ایک مزید بار ہوگا جنہیں دونوں کو سیکھنا پڑے گا اور یہ ایک حد تک علیٰحدگی پسندی کے لیے بھی مددگار ہوگا، مگر ہمیں انہی نقصانات کے ساتھ کام کرنا پڑیگا کیونکہ ہمارے لیے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے ...... مستقبل ہمارے لیے کیا کچھ لائیگا اس کی مجھے خبر نہیں، مگر سردست دونوں کو باقی رہنا چاہیے" (پنڈت جی کا مذکورہ بالا مضمون)

"میں اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتا کہ ہندی اور اردو دونوں ایک دوسرے کے قریب آکر رہیں گی ——— خواہ یہ دونوں مختلف لباس پہنے رہیں، مگر اپنے جوہر اور روح کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہوں گی۔ جو قوتیں اس وحدت کی تائید کر رہی ہیں وہ اسقدر طاقتور ہیں کہ افراد ان کی مزاحمت نہیں کرسکتے۔ یہاں قوم پرستی ہے اور ایک ہندوستان دیکھنے کی خواہش عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی کی فتح ہوکر رہے گی ...... اگرچہ ہم خوشی کے ساتھ اس علیحدگی کو برداشت کریں گے جو اس وقت قائم ہے، مگر ہم کو وحدت قائم کرنے والے اس عمل میں مدد دینی چاہیے"۔ (مضمون مذکور)۔

یہاں آکر پنڈت جواہر لال اور مہاتما گاندھی کے راستے مل جاتے ہیں۔ اگرچہ پنڈت جی علیٰحدگی کے رجحان کو سخت قابل نفرت سمجھتے ہیں، اور مہاتما جی کے طرز عمل میں علیٰحدگی پسندی کا یہ رجحان بالکل

نمایاں ہے' اس بنا پر پنڈت جی کو مہاتما جی سے نہ صرف اختلاف کرنا چاہیے تھا بلکہ انہیں "فرقہ پرست" اور سیاسی رجعت پسند" کہنا چاہیے تھا، مگر چونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے' اور دونوں ایک ہی منزل مقصود کی طرف دو علٰحدہ راستوں سے چل کر ایک مقام پر مل جاتے ہیں اس لیے دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو کھرچنے کی ضرورت نہیں سمجھتا' بلکہ پنڈت جی مہاتما جی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ کم سمجھ لوگ خود گاندھی جی کو اُس چیز کا مجرم ٹھیراتے ہیں جس کے خلاف انہوں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے" (جامعہ" مورخہ اکتوبر ۳۶ء ص ۳۰۹) ۔

کھلی ہوئی "فرقہ پرستی" کے مقابلہ میں" قوم پرستی" زیادہ کامیاب چیز ہے ۔ آپ علانیہ پرندوں کے سامنے جال پھیلائیں گے تو چند بے وقوف پرندوں کے سوا کوئی اس میں نہ پھنسیگا ۔ دام ہمرنگ زمین ہونا چاہیے ، دانہ بکھرا ہوا ہونا چاہیے' اور ایک ہوشیار شکاری جو پرندوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہو آپ کی مدد پر ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر طرف سے گھیر گھیر کر پرندوں کو دام کے پاس لائے ۔ پھر دیکھیے پرندوں کے رب النوع تک جال میں پھنسے ہوئے نظر آئیں گے ۔ ہندوستان کی مشترک فلاح و بہبود کا نام لے کر "قومیت" کا جال بچھایئے ۔ اس پر سیاسی ترقی اور معاشی خوشحالی کا دانہ پھیلایئے ۔ اور ایک نقیب چھوڑ دیجیے جو اطراف و نواح میں اعلان کرتا پھرے کہ جو پرندہ اس جال کی طرف نہ آئے گا وہ فرقہ پرست اور سیاسی رجعت پسند قرار دیا جائیگا' اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جائے کہ ہمارے سامنے اس وقت سب سے بڑا سوال ہندوستان کے افلاس اور بے روزگاری کا ہے اور یہ دانہ جو بکھرا ہوا ہے (نیچے بچھے ہوئے جال کا ذکر نہ کیجیے) اسی سوال کو حل کرنے کے لیے بکھیرا گیا ہے ۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جھنڈ کے جھنڈ آپ کی طرف آئیں گے اور اس طرح آپ کے جال پر گریں گے جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں ۔

مشترک ہندوستانی قومیت کی تخلیق کے لیے اردو کو ہندی کے ساتھ ملانے کی جو تحریک زور شور کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہے اس کا اثر یہ ہے کہ اردو برابر ہندی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے' اردو

تحریروں میں روز بروز ہندی الفاظ کا اضافہ ہو رہا ہے، اور ہمارے علمائے کرام تک عربی و فارسی کے الفاظ کو نکال کر ہندی الفاظ اردو میں استعمال کرنے کی نہ صرف حمایت بلکہ تاکید فرما رہے ہیں، اگر ہندی ادب میں اردو کی طرف قدم بڑھانے کا ادنیٰ امیلان تک نہیں پایا جاتا۔ اس کی بہترین شہادت سندر لال جی الہ آبادی کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو گاندھی جی کے نام لکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"اردو رسالوں میں ودوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ ایک مسلم اردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہوگا، ودوان (عالم) ایڈیٹر نے جواب دیا کہ میں حجازی اردو سے اپنے رسالے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔ اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اردو رسالوں میں ہو رہا ہے کسی ہندی رسالہ میں نہیں ہو رہا ہے۔ لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال سے میں نے اردو نظم و نثر کے چند نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کانووکیشن ایڈریس میں نقل کیے تھے جنہیں اگر آپ جوں کا توں ناگری حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ اردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شائد کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا......

آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سندر ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سن کر اردو وال اور ہندی وال دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ دونوں سمجھتے تھے۔ لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے جامعہ میں چھپی ہے وہ"

وہ چیز نہیں ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی جیسے وودان جنہوں نے اپنی یوم النبی کی چھپی ہوئی تقریر میں بجائے حضرت محمدؐ کے سوامی محمدؐ لکھا ہے برسوں سے زوروں کے ساتھ کھلے طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اردو کو سہل ہندوستانی بنانا چاہیے بلکہ اردو کی جگہ اسے ہندوستانی کہنا چاہیئے"۔ (رسالہ "جامعہ" مورخہ اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۸۷ - ۴۸۶)

یہ اقتباس کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔ اس کو پڑھ کر وہ تصویر خود بخود آپکے سامنے مکمل ہوجاتی ہے جسے میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف "قوم پرست" اس ملک کی آبادی کو "ایک قوم" بنانے کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں، اور دوسری طرف ہمارے نیک دل بھائی ابھی تک اسی بھول بھلیاں میں چکر لگا رہے ہیں کہ اردو کو اپنے "طاقت ور دلائل" اور اپنے عمل سے ہندوستان کی مشترک زبان ثابت کردیں۔ یہ حضرات اردو کی تاریخ پر عالمانہ مقالات لکھ رہے ہیں حالانکہ "قوم پرستوں" کو ان مقالات میں صرف ایک ہی کام کی بات ملتی ہے، یعنی یہ کہ اردو کوئی الگ زبان نہیں ہے بلکہ یہی ہندی ہے جس کے مفہوم میں شبلی اور شام سندر داس دونوں کی تحریریں آجاتی ہیں۔ یہ حضرات آدھے رستے پر ملنے (Meeting half ways) کا طریقہ اختیار کرکے اردو کو نیم ہندی بنانے کی کوشش کیے جا رہے ہیں، حالانکہ جن سے یہ آدھے رستے پر ملنا چاہتے ہیں وہ بجائے آگے بڑھنے کے اور پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں ــــ کہیں پیچھے ہٹنے کا مفہوم "رجعت پسندی" نہ سمجھ لیجیے گا۔ یہ اصطلاح صرف مسلمانوں کے لیے وضع کی گئی ہے ـــــ اور اس فکر میں ہیں کہ جہاں تک ہوسکے اردو زبان عربی و فارسی سے بعید تر اور سنسکرت سے قریب تر ہوتی چلی جائے۔ یہ حضرات اردو کا نام "ہندوستانی" رکھ کر اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ گویا بڑی ہی دانشمندانہ چال چل گئے ہیں جس کے بعد اردو اتھوا ہندوستانی کو ہندوستان کی "قومی زبان" تسلیم کرلیا جائیگا، حالانکہ وہاں قومی زبان کا نام پہلے ہی

"ہندی اتھوا ہندوستانی" تجویز ہو چکا ہے، اور اس کو بدلنے کے لیے وہ طاقت چاہیے جو کانگریس کے ڈکٹیٹر، یعنی "جنگ آزادی" کے سالارِ اکبر کو حاصل ہے۔۔۔ غرض یہاں استدلال اور رواداری پر بھروسہ کیا جا رہا ہے اور وہاں کام ہی دوسرا ہو رہا ہے۔

اگر آپ اس خوابِ غفلت میں مبتلا نہیں ہیں جس میں آپ سے پہلے اسپین کے مسلمان مبتلا ہو کر اپنا انجام دیکھ چکے ہیں تو کان کھول کر سن لیجیے کہ "قوم پرست" یہ تہیہ کر چکے ہیں کہ مسلمان کی جداگانہ ہستی ہندوستان میں نہ رہنے دی جائے گی اور اس مقصد کے لیے زبان کا بدلنا نہایت ضروری ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ اردو پر اعتراض اس کے رسم الخط کی دشواریوں کی وجہ سے ہے یا طباعت کی مشکلات اور عربی و فارسی الفاظ کی زیادتی، اور عامۃ الناس کی نافہمی کی وجہ سے ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس پر اصلی اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے جداگانہ رسم الخط، اپنے ذخیرۂ الفاظ اور اپنے اسالیب بیان کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر ان کے اس امتیازی قومی وجود کا احساس زندہ رکھے ہوئے ہے جسے پنڈت جواہر لال نہرو "علیحدگی پسندی کے رجحان" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ یہ اعتراض اگر آپ کو رفع کرنا منظور ہے تو اپنی رواداری کا ثبوت دیے جائیے، اور اگر آپ اس کو رفع کرنا نہیں چاہتے۔۔۔ اور خدا کرے کہ ابھی تک آپ اس مقام پر نہ پہنچے ہوں۔۔۔ تو جتنے جلدی آپ ہوش میں آ جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔

مسلمان کو اس کی ضرورت سے زیادہ رواداری نے اکثر تباہ کیا ہے۔۔۔ رواداری بڑی عمدہ چیز ہے، بشرطیکہ خودکشی پر آمادہ نہ کر دے۔۔۔ دوسرے معاملات کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی یہ اپنی اسی رواداری سے کام لے رہا ہے۔ ہاتھ باندھ باندھ کر منتیں کرتا چلا جا رہا ہے کہ مہاراج! ہم اردو کا نام بدلے لیتے ہیں۔ ہم اس کے رسم الخط کو بھی درست کر لیں گے۔ ہم توبہ کرتے ہیں کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ بھی نہیں لائیں گے۔ آپ خود دیکھ لیجیے کہ ہم ہندی کے الفاظ کس کثرت سے

اس زبان میں داخل کر رہے ہیں ہم آپ کے ہر برتاؤ کا سواگت کرتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سارے ہندوستان کی جنتا کے سماجی سدا ہار کے لیے ہے۔ پرنتو آپ سے کیول اتنی آشا ہے کہ ہمیں اس بھاشا کو زندہ رکھنے کی آگیا دے دیجیے۔۔۔ یہ روش بڑی تباہ کن ہے۔ اس کا کوئی مفید اثر "قوم پرستوں" پر نہیں پڑ سکتا۔ ان کو آپ کی زبان کی "دشواریاں" اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کرتیں بلکہ وہ جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے جس کے تحت اسپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی نادرۂ روزگار عمارات کے حسین و جمیل نقوش کھرچ ڈالے تھے، اس لیے نہیں کہ ان کو آرٹ سے کوئی دشمنی تھی، بلکہ صرف اس لیے کہ اسلامی خون رکھنے والی نسلوں میں ان نقوش سے اپنے ماضی کی اور اپنی قومیت کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت زبان سے "علیحدگی پسندی کے رجحان" کو مٹانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں اور مسلمان سمجھ رہا ہے کہ رواداری سے کوئی بین بین راستہ پیدا ہو جائیگا۔

تم ریڑھ کی ہڈی کے بغیر محض نرم گوشت بن کر اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر استقامت چاہتے ہو تو اپنے اندر ریڑھ کی ہڈی پیدا کرو۔ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے" تو کیوں نہیں کہتے کہ ہاں صاحب! یہ ہماری زبان ہے، ہماری زبان رہے گی اور جب تک ہم موجود ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

داستان طویل ہوتی جا رہی ہے لیکن ابھی ایک عنوان اور بھی ہے جسے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ہم زبان کا تحفظ چاہتے کس لیے ہیں؟ زبان بذات خود تو کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اسلیے محض اس کا تحفظ مقصود بالذات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زبان کا تحفظ ہم اس لیے چاہتے ہیں کہ اسکے ذریعہ ہمارے تمدن ہمارے کلچر کی حفاظت ہوتی ہے لیکن کیا جو کچھ آج کل عام طور پر ہماری ادبی پیداوار ہے وہ ایسی ہی ہے کہ جسے اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت کا آئینہ دار کہا جا سکے؟

جواب ظاہر ہے! ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایک جماعت تو ایسی ہے جس نے اپنی تمام مساعی کو اِس بات کے لیے وقف کر رکھا ہے کہ مذہب اور شعائر ملت کے خلاف "جہادِ عظیم" کیا جائے۔ اول تو کالجوں کی تعلیم ہی اس نہج کی رکھی گئی ہے کہ بی۔ اے کرنے تک دماغ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو جاتا ہے۔ اُس پر آزادیٔ ہند کے قائداعظم کے یہ ارشادات کہ ملک میں جس قدر مصائب موجود ہیں، ان سب کا ذمہ دار مذہب ہے، نوجوانوں کو مذہب کی مخالفت، نہیں بلکہ تضحیک و تمسخر کے لیے بالکل مسلح کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اشتراکیت کی ایک خیالی جنت کے نشہ میں اس درجہ مدہوش و بیباک ہو جاتے ہیں کہ سوقیانہ استہزا اور بازاری تمسخر ان کے نزدیک عین معیارِ شرافت قرار پا جاتا ہے۔ اس پر کسی نیاز کسی جوش کی شاباش سمندِ ناز پر تازیانہ کا کام کرتی ہے، اور اس بدمستی میں، بقول یلدرم ان کے منہ سے بوئے فحش کے ایسے بھپکے نکلتے ہیں کہ نکیرین بھی پناہ مانگیں۔

ایک اور جماعت ہے جو جدید رومانیت کی علمبردار ہے۔ ہماری قدیم غزل گوئی کے خلاف ان کا وعظ سنیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتذال اور سوقیانہ پن کا لفظ تک سننے کے لیے یہ تیار نہیں ہیں۔ اس شاعری میں انھیں دنیا بھر کے عیب نظر آئیں گے۔ لیکن انشا، رنگین، جرأت، جان صاحب اور رمز، اشوق کو مبتذل اور فحش گو کہنے والے وزرا یہ تو دیکھیں کہ جس قسم کی عریاں فحاشی ان کے افسانوں اور (Sonates) میں آج کل ملتی ہے، اُن بیچاروں کے تصور میں بھی اس قسم کے نقشے نہ آسکتے تھے۔ وہ تو پھر ایک فرضی معشوق کی چوٹی کو ہی نمایاں کرتے تھے۔ اور آج یہ حالت ہے کہ وسیع مع غتقبازی کی جاتی ہے اور نامے کے کردار دات قلب کے مرقع تیار کیے جاتے ہیں، جن سے اور کچھ نہیں تو ذہنی تعیش اور دماغی معصیت کوشی کی لذت تو ضرور مل جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس مغربی معاشرت کا نتیجہ ہے جو غیر محسوس طور پر ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ پر چھا گئی ہے، اور جس کے تحت حیا سوز سفلی جذبات کے اظہار کا نام رومانیت رکھا جاتا ہے۔ اگر آپ کو دیکھنا ہو کہ اس رومانیت سے

یورپ کی اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے تو ایک اطالوی مصنف کی کتاب (The Romantic Agony) ملاحظہ فرمائیے پھر یہ بھی دیکھیے کہ اس قسم کی افسانہ نگاری اور شاعری کا اخلاق کے علاوہ نوجوانوں کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ایسے نوجوان کا دماغ شروع سے ہی حقائق کی دنیا میں رہنے کے بجائے ایک افسانوی دنیا کے تصورات و تخیلات میں محو رہتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ جب دنیا کی حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے، تو ان کو اپنے افسانوی معیار پر پورا اُترتے نہیں دیکھتا۔ اس لیے وہ ان چیزوں سے بیزار ہو جاتا ہے، یاس و قنوطیت کا المناک حلقہ اس کے تمام اعمال و افکار پر چھا جاتا ہے۔ اور وہی نوجوان جس کی قوت عمل سے قوم کو زندہ ہونا تھا۔ خود ایک چلتا پھرتا جنازہ بن کے رہ جاتا ہے۔

ایک تیسری جماعت اور ہے اور وہ (Art for Art's sake)۔ (آرٹ محض آرٹ کی خاطر) کا قائل ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور جملے ایسے مہمل گورکھ دھندے ہیں جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوتے بے معنی تراکیب۔ بے مطلب فقرے۔ نثر منظوم۔ نظم منثور۔ ٹیگوری رنگ میں مجذوبوں کی سی بڑیں۔ نہ جن کا سر نہ پاؤں۔ یا تو یہ لوگ عمداً دوسروں کو بناتے ہیں یا خود بنتے ہیں۔ غالب کے تتبع میں غزلیں لکھی جاتی ہیں جن میں شوکتِ الفاظ اور ندرتِ ترکیبات کے زور پر سننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

عصمتِ ناہید و کوثر نوبہارِ نغمہ ہے   شعلۂ جوالۂ مے۔ اعتبارِ نغمہ ہے

بوئے رنگیں عنبر فشاں یرمریں رنگِ شباب   کیفِ صہبائے تمنا۔ جوئبارِ نغمہ ہے

یا مثلاً نثر میں پیازی ادب کہ چھلکے پر سے چھلکا اتارتے جائیے۔ اندر سے کچھ بھی نہ نکلے:۔

"ریحانہ، نور و سرور کی داستانِ شیریں، منجمد افسردہ یاسمین کا بلوریں مجسمہ، گویا قدرت کا ایک حسین خواب تھا جو رشید کی نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی سنہری راتوں میں بہارِ صد گلستاں بداماں،

کیف زا نوائے رنگین پیدا کرتی تھی"

آرٹ سے مقصود کیا ہے۔ اس کے متعلق دورِ حاضر کے سب سے بڑے باریک بین مبصر علامہ اقبال کی رائے قابلِ غور ہے، انہوں نے رسالہ نیوایرا میں تحریر فرمایا ہے کہ :۔

"حیات تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے۔ انسانی اعمال کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسکی زندگی شاندار، موثر اور افزوں ہوجائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصدِ عظمیٰ کے ماتحت رکھا جائے، اور جو شئے زندگی کو جس قدر فراوانی عطا کرے اسی قدر اعلیٰ واشرف خیال کی جائے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفتہ قوتِ ارادی کو بیدار کر دے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرسکیں۔ وہ تمام علوم وفنون جو خواب آور ہیں، جو ہمیں گردوپیش کے ان حقائق سے غافل کر دیں جن کی معرفت ہی پر زندگی کا انحصار ہے، وہ دراصل بربادی وموت کا پیغام ہیں۔ آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی روح پھونک دے، نہ کہ وہ جو ہم پر حالت سکر طاری کر دے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے، وہ نادانستہ طور پر ہمیں گمراہ کرنے اور ہماری زندگی اور توانائی کو فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا ازبس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں"۔

اسی نظریہ کو وہ ضربِ کلیم میں ان اشعار میں بیان فرماتے ہیں :۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا !

اقبال کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ وہ خود ایک پیغام بر ہے[1] اور اس کی شاعری یکسر پیامی ہے اس لیے اس نے آرٹ کی یہ تعریف کی ہے لیکن یہ تعریف صرف اقبال ہی کے ہاں نہیں ملتی، بلکہ معترضین کے "خدایان سخن" یعنی شعرائے مغرب بھی یہی کچھ کہتے ہیں۔ ورڈز ورتھ کی شاعری کا مطمح نگاہ کسے معلوم نہیں۔ اس کا دوست کالرج (Biographia Literaria) میں لکھتا ہے کہ "کوئی شخص آج تک ایسا نہیں گذرا جو بہت بڑا شاعر ہو، لیکن اس کے ساتھ ایک مفکر اعظم بھی نہ ہو"۔ میتھو ارنلڈ لکھتا ہے کہ "ایک شاعر کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنے خیالات کا انطباق مسائل حیات سے کس طرح کرتا ہے اور اس سوال کا حل کیا پیش کرتا ہے کہ زندگی کیسے بسر کی جائے"۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاعر جب پیغامبر یا مصلح ہو جاتا ہے تو اس کی شاعری میں فنی لطافتیں، ادبی نفاستیں حسن ترنم، اور طرفگی انداز و بیان باقی نہیں رہتا۔ اول تو یہ کلیہ غلط ہے۔ ہمارے سامنے دور حاضر کا سب سے بڑا شاعر، اقبال موجود ہے۔ جو درحقیقت ایک بالغ نظر مفکر اور بلند پایہ پیغامبر ہے لیکن بایں ہمہ اُس کے کلام میں ادبی لطافتیں اس حسن و خوبی سے موجود ہیں کہ باید و شاید۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کلام کے پیامی ہونے سے اس میں ادبی خوبیاں کم ہو جاتی ہیں تو یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی قیمت بہت زیادہ وصول ہو جاتی ہے۔ آرٹ کے متعلق جب نظریہ صحیح ہو جائے تو پھر دیکھیے کہ کونسا ادب اور کونسی شاعری آپ کو حیات بخش نظر آتی ہے، اور کونسی محض تفنن طبع اور کونسی غارت گر حیات؟ اسی نظریہ کا فرق ہے کہ ایک طرف حقائق کی جستجو کرنے والوں نے اقبال کے کلام سے نئی زندگیوں کی تعمیر کر لی، اور دوسری طرف آگرہ اور لکھنؤ ہنوز اسی الجھن میں گرفتار ہیں کہ اسنے

[1] پیغمبر کے مفہوم سے جدا کرنے کے لیے یہ طریق املا اختیار کیا گیا ہے۔

بلبل کو مذکر باندھا ہے یا مونث، اور نہ معلوم ابھی کب تک اس تحقیق عظیم کا سلسلہ جاری رہے گا کہ بلبل فی الواقع مونث ہے یا مذکر؟

مقصد اس طویل داستان سے یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی تو اسلامی ہونا چاہیے۔ بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع ایک عظیم الشان خطرہ کا سامنا ہے۔ یہ وقت وہ ہے کہ جو کچھ جس کے بس میں ہو اس متاعِ گرانمایہ کی حفاظت کے لیے کر گزرے۔ یہی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے۔ طریق کار خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہماری تمام جدوجہد کا رخ اسی ایک نصب العین کی طرف ہونا چاہیے۔ ادیب اپنے ادب سے، شاعر اپنے شعر سے، افسانہ نگار اپنے افسانوں سے، رسائل اپنے صفحات سے، خریدار اپنے ذوقِ ادب و شعر سے، غرض ہر مسلمان اپنے اپنے دائرۂ امکان میں اپنی ہر کوشش اسی مقصد کے حصول میں صرف کر دے۔ ہمارے رسائل میں "مذہبی" اور "ادبی" کی تفریق دراصل اُس تفریق پر مبنی ہے جو کلیسا اور سلطنت کی تفریق سے پیدا ہوتی ہے، اور جو یکسر غیر اسلامی تفریق ہے۔ ہمارے ہر پرچہ کو اسلامی ہونا چاہیے، اور اس کی ادبی و صحافتی خدمات اسی عنوان کی تفسیرات ہونی چاہئیں۔ ادب پسند حضرات کو بھی اس تبدیلی نصب العین سے قطعاً نہیں گھبرانا چاہیے کیونکہ "اسلامیات" اور "مولویات" میں درحقیقت بہت نمایاں فرق ہے۔ لیکن آج کل تو ہمارے ہاں یہ حال ہو رہا ہے کہ کوئی پرچہ جو اپنی پیشانی پر "علمی و ادبی مجلّہ" کا عنوان لکھ لیتا ہے، اسلام اور مسلم کا لفظ بھی اس کے اندر لکھنا کفر سمجھتا ہے۔ میں ادب و شعر کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ادب و شعر ہماری عمارتِ ملی کی جڑ نہیں ہیں، محض تزئین و آرائش کی چیزیں ہیں۔ جب کسی عمارت کی بنیادیں ہی خطرہ میں ہوں تو کوئی صاحبِ دانش و بینش اس وقت اپنی کوششیں

اس کی تحسین و تزئین میں صرف نہیں کرتا بلکہ سب سے مقدم کام خود عمارت کے استحکام کو سمجھتا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ جب ہم اس تبدیلی کا اعلان کریں گے۔ تو اطراف و جوانب سے ہم پر انگلیاں اٹھیں گی لیکن بقول مولانا حالی "دل فریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ اس "تحریک آزادی" میں آپ کے لیے کیسی کیسی خوبصورت "زنجیریں" تیار ہو رہی ہیں۔ اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ زنجیریں کیا کریں گی، تو ہندوستان کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے یہاں یونانی آئے، پارتھین آئے، باخترین آئے، ہن آئے، اور متعدد قومیں یکے بعد دیگرے آئیں لیکن آج ذرا چراغ لے کر ڈھونڈو تو سہی کہ ان قوموں کا کہیں سراغ بھی مل رہا ہے؟ یہ کہیں باہر تو واپس چلی نہیں گئیں۔ پھر آخر کیا ہوئیں کیوں نظر نہیں آتیں؟ اس کا جواب تاریخ یہ دیتی ہے کہ انہوں نے خود فراموشی کا جرم کیا تھا اس لیے فنا ہو گئیں۔ جب یہ ہندوستان آئی تھیں تو اپنی الگ زبان الگ تہذیب الگ تمدن، الگ مذہب رکھتی تھیں۔ مگر انہوں نے اپنے امتیازی وجود کی حفاظت نہ کی اپنے آپ کو اس ملک کی عام آبادی میں محو کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ صرف افسانے رہ گئے۔ اب کیا آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے بجائے صرف آپ کے افسانے باقی رہ جائیں؟

ہو سکتا ہے کہ ہم اس آنے والے سیلاب کا پوری طرح مقابلہ نہ کر سکیں۔ لیکن جب اس کا مقابلہ کرتے کرتے ہمارے ہاتھ شل ہو جائیں گے، ہمارے بازوؤں میں قوت نہ رہے گی، جب ہمیں موجوں کے تھپیڑے بالکل نیم مردہ کر کے ساحل کی ریت پر پھینک دیں گے تو اس آخری وقت میں کم از کم اتنا اطمینان تو ضرور ہو گا کہ بزدلی کی زندگی جینے سے یہ مردانگی کی موت ہزار درجہ بہتر ہے۔"

دارالاسلام

(اسی اشاعت میں صفحہ اول پر یہ اعلان ناظرین کے ملاحظہ سے گزر چکا ہے کہ دفتر ترجمان القرآن ماہ ذی القعدہ میں "دارالاسلام" کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔۔۔ اس کو دیکھ کر فطرۃً آپ کے دل میں سوال پیدا ہو گا کہ یہ دارالاسلام کیا چیز ہے؟ ذیل کا مضمون اسی سوال کا جواب ہے)

مقام پنجاب کے ضلع گورداسپور میں پٹھان کوٹ ایک مشہور قصبہ ہے۔ اس سے چند ہی میل کے فاصلہ پر کوہستان ہمالیہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور اس کے قریب ہی وہ مقام واقع ہے جہاں سے دریائے راوی پہاڑوں کی آغوش سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقہ میں آتا ہے۔ مناظر کے لحاظ سے یہ علاقہ بہت فرحت بخش ہے۔ آب و ہوا اچھی ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ پانی کی افراط ہے۔ قدرت نے میلوں تک جنگلوں کو باغ بنا رکھا ہے۔

اسی علاقہ میں پٹھان کوٹ سے چار میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں جمال پور واقع ہے جہاں چند بندگان خدا نے "دارالاسلام" کی بنا رکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس غرض کے لیے ساٹھ ستر ایکڑ زمین حاصل کر لی گئی ہے جو راہ خدا میں وقف ہے۔ ایک مسجد، ایک کتب خانہ کی عمارت ایک دارالاقامہ (جو بیس پچیس آدمیوں کے لیے کافی ہو سکتا ہے) اور دو مکان تعمیر کر لیے گئے ہیں سردست کام کی ابتدا کرنے کے لیے اتنی عمارتیں کافی ہیں۔ زمین وقف میں اتنی گنجائش ہے کہ آئندہ جیسی ضروریات پیش آئیں ان کے مطابق جدید عمارتیں بنا لی جائیں۔ نیز اطراف و اکناف میں پھیلنے کے لیے بھی بہت کافی جگہ موجود ہے اور وقف کی زمین اتنی زرخیز و شاداب ہے کہ اگر اسے صحیح طریقہ پر استعمال کیا جائے تو پانچ چھ ہزار روپیہ سالانہ آمدنی دے سکتی ہے۔ یہ ان ابتدائی کاموں کے لیے کافی ہے جو

پیش نظر ہیں۔ شہری آبادیوں سے یہ جگہ دور بھی ہے اور یہاں وہ آسانیاں بھی بہم پہنچ سکتی ہیں جو شہری زندگی کے لیے درکار ہیں۔ ریلوے اسٹیشن سرنا (جو امرتسر پٹھان کوٹ لائن پر واقع ہے) یہاں سے صرف دس منٹ کی مسافت پر ہے۔ قریب ہی سے برق آبی (ہائیڈرو الکٹرک سسٹم) کا سلسلہ گزرا ہے جس سے ضرورت کے وقت نہایت سستی بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف ایک بہت بڑی نہر (جس میں پورا دریائے راوی منتقل کر دیا گیا ہے) زمین وقف سے متصل ہو کر ہی گزری ہے۔ اور یہ پانی حاصل کرنے کا ایسا ذریعہ ہے جو تمام ضروریات کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ غرض یہاں ترقی کے امکانات غیر محدود ہیں، اور اس کے ساتھ یہ مقام شہری آبادیوں سے اتنی دور ہے کہ ہم کو ایک آزاد ماحول میسر آسکتا ہے جس میں ہم اپنی دنیا الگ بنا سکتے ہیں۔

مقصد اس الگ تھلگ، باہمہ و بے ہمہ مقام پر جس تخیل کو ہم عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں اس کے لیے "دار الاسلام" کے سوا اور کوئی نام جامع و مانع نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی ایک نام ہے جو اس کے تمام حدود پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اصطلاح فقہی سے قطع نظر کیجیے کہ اس کے لحاظ سے تو دار الاسلام صرف اس جگہ کو کہیں گے جہاں اسلامی حکومت ہو اور اسلامی قانون بغیر کسی منع و مزاحمت کے پوری طرح نافذ ہو۔ بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں ایسی کوئی جگہ تو ہم کو میسر نہیں آسکتی۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت جیسے کچھ حالات بھی ہندوستان کے ہیں، انہی میں کم از کم زمین کا ایک گوشہ ایسا بہم پہونچایا جائے جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جا سکے۔ جہاں اخلاق اسلامی ہوں، معاشرت اسلامی ہو، علمی زندگی مسلمانوں کی سی ہو، گرد و پیش ہر طرف اسلام اپنی روح اور اپنی صورت کے ساتھ نمایاں ہو۔ جہاں کسی چیز کے صحیح ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی ہو کہ خدا اور رسول نے اس کا حکم دیا ہے یا اس کی اجازت دی ہے، اور کسی چیز کا غلط ہونا صرف اس دلیل سے تسلیم کیا جائے کہ خدا اور اس کے رسول نے اس سے منع کیا ہے یا اس کو ناپسند کیا ہے۔ جہاں یہ بغاوت اور سرکشی کا ماحول

یہ غیر اسلامی فضا نہ ہو جس نے سارے ہندوستان کا احاطہ کر لیا ہے۔ جہاں ہم کو کم از کم اتنا اختیار تو ہو کہ بیرونی دنیا کے جن اثرات کو ہم روح اسلامی کے موافق پائیں صرف انہی کو داخل ہونے دیں اور جن کو منافی پائیں ان کو اپنی زندگی پر مسلط ہونے اور اپنے دل و دماغ میں نفوذ کرنے سے روک سکیں۔ سیاسی اقتدار کے بغیر محض اجتماعی کوشش سے جس حد تک بھی اسلامی ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اسے پیدا کریں اور ایسے ماحول میں رہ کر مسلمان کی طرح سوچیں، مسلمان کی نظر سے دیکھیں، مسلمانوں کی سی صفات اپنے اندر پیدا کریں، اپنی زندگی کو مسلمان کی زندگی بنائیں اور اپنے اندر سے ان گندگیوں اور آلائشوں کو نکالیں جو غیر اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولنے اور نشوونما پانے کی وجہ سے ہمارے افکار اور اعمال میں گھس گئی ہیں، جن کا شعور تک بھی بسا اوقات ہم کو نہیں ہوتا اور جن کو اگر ہم محسوس بھی کر لیتے ہیں تو ماحول کی طاقت اتنی جابر و قاہر ثابت ہوتی ہے کہ باوجود کوشش کرنے کے ہم اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو ان سے نہیں بچا سکتے۔ اس قسم کی اخلاقی تربیت سے جو قوت ہمارے اندر پیدا ہو ہم چاہتے ہیں کہ اسے اس نصب العین کی خدمت میں صرف کریں جو مسلمان کی زندگی کا واحد نصب العین ہے، یعنی یہ کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اس کے مقابلے میں سب کلمے دب جائیں۔ اسکے معنی بس اتنے ہی نہیں ہیں کہ محض تبلیغ اسلام کی جائے جس طرح عیسائی مشنری مسیحیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نظام زندگی کو عملاً نافذ کر کے بتایا جائے جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ ان اصولوں کو واقعات کی دنیا میں برت کر دکھایا جائے جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

آج اس بیسوی صدی میں ہندوستان کے اندر ہمارے سامنے زندگی کے جو مسائل درپیش ہیں انہیں علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے اصول اسلام کے مطابق حل کیا جائے، اور تیرہ سو برس کے پرانے اسلام کو اس جدید دور حیات میں کام کرتے ہوئے دکھا دیا جائے تاکہ مسلمان اور غیر مسلم سب اس کو اس کی اصلی صورت میں ایک زندہ، متحرک، کارکن، کارفرما اور پیش رو طاقت کی حیثیت سے دیکھیں، اور اس کا بہترین نظام زندگی ہونا ہمارے زبانی ادعا سے نہیں بلکہ دماغوں کو مطمئن کرنے

والے علمی استدلال اور آنکھوں کو نظر آنے والے عملی مظاہر سے ثابت ہو جائے۔

ضرورت | اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے، نہ وہ محض چند "مذہبی" اعمال اور رسموں کا مجموعہ ہے، بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ سب مل کر ایک ناقابل تقسیم مجموعہ بناتے ہیں جس کے اجزا کا باہمی ربط بالکل ایسا ہی ہے جیسا ایک زندہ جسم کے اعضا میں ہوتا ہے۔ آپ کسی زندہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیں، آنکھیں اور کان اور زبان جدا کر دیں، معدہ اور جگر نکال دیں، پھیپھڑے اور گردے الگ کر دیں، دماغ بھی پورا یا کچھ کم و بیش کاسۂ سر سے خارج کر دیں، اور بس ایک دل اس کے سینے میں رہنے دیں۔ کیا یہ باقی ماندہ حصۂ جسم زندہ رہ سکیگا؟ اور اگر زندہ بھی رہے تو کیا وہ کسی کام کا ہوگا؟ ایسا ہی حال اسلام کا بھی ہے۔ عقائد اس کا قلب ہیں۔ وہ طریق فکر، نظریۂ حیات، مقصد زندگی اور معیار قدر جو ان عقائد سے پیدا ہوتا ہے اس کا دماغ ہے۔ عبادات اس کے جوارح اور قوائم ہیں جن کے بل پر وہ کھڑا ہوتا ہے اور کام کرتا ہے۔ معیشت، معاشرت، سیاست اور نظم اجتماعی کے دوسرے اصول جو اسلامی زندگی کے لیے اس نے پیش کیے ہیں وہ اس کے لیے معدے اور جگر اور دوسرے اعضائے رئیسہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کو صحیح و سالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ زمانے کے احوال و ظروف کی ٹھیک ٹھیک رپورٹیں دماغ تک پہنچائیں اور دماغ ان کے متعلق صحیح حکم لگائے۔ اس کو اپنے قابو کی زبان درکار ہے تاکہ وہ اپنی خودی کا کماحقہٗ اظہار کرے۔ اس کو پاک صاف فضا کی حاجت ہے جس میں وہ سانس لے سکے۔ اس کو طیب و طاہر غذا مطلوب ہے جو اس کے معدے سے مناسبت رکھتی ہو اور اچھا خون بنا سکے۔ اس پورے نظام میں اگرچہ قلب بہت اہمیت رکھتا ہے، مگر اس کی اہمیت اسی لیے تو ہے کہ وہ تمام اعضاء و جوارح کو زندگی کی طاقت بخشتا ہے۔ جب اکثر و بیشتر اعضاء کٹ جائیں

جسم سے خارج کر دیے جائیں یا خراب ہو جائیں تو اکیلا قلب تھوڑے بہت بچے کھچے خستہ و بیمار اعضاء کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے، اور اگر زندہ بھی رہے تو اس زندگی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ اس وقت آپ اپنی اسی ہندوستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں۔ قوانین اسلامی قریب قریب معطل ہیں۔ اخلاق میں، معاشرت میں، معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصولِ اسلامی کا نفاذ پانچ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کچھ کم و بیش غیر مسلم بنا دیا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں مگر ان کا زاویۂ نظر بدل گیا ہے، کان سنتے ہیں مگر ان کے پردے متغیر ہو چکے ہیں، زبان بولتی ہے مگر اس کی گویائی میں فرق آگیا ہے۔ پھیپھڑوں کو صاف ہوا میسر نہیں کہ ایک زہریلی فضا چاروں طرف محیط ہے۔ معدے کو پاک غذا نہیں ملتی کہ رزق کے خزانے مسموم ہو چکے ہیں۔ عبادات جو اس جسم کے جوارح اور قوائم ہیں قریب قریب ۶۰ فی صدی تو مفلوج ہیں اور چالیس فیصدی جو باقی ہیں وہ بھی کوئی اثر نہیں دکھا رہے ہیں۔ کیونکہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔ اسی لیے فالج کا مادہ ان میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا اسلام ہے جو آپ کے سامنے ہے؟ کتنے ہی اعضاء کٹ گئے۔ کتنے مفلوج ہو گئے۔ کتنے موجود ہیں مگر بیمار ہیں اور ٹھیک کام ہی نہیں کر رہے ہیں۔ انکے ساتھ ایک قلب باقی ہے، اور وہ خود بیمار ہو رہا ہے۔ کیونکہ جس طرح وہ ان اعضاء کو زندگی کی طاقت بخشتا تھا اسی طرح خود بھی تو ان سے طاقت حاصل کرتا تھا۔ جب دماغ اور پھیپھڑوں اور معدہ و جگر سب کا فعل خراب ہو گیا تو قلب کیسے صحیح و سالم رہ سکتا ہے۔ یہ محض اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے، بلکہ بچے کھچے اعضا کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہا ہے، مگر کیا اس اعضاء بریدہ اسلام میں کوئی کشش ہو سکتی ہے کہ یہ اپنی طرف لوگوں کو کھینچے؟ کیا اس میں یہ طاقت ہے کہ ہندوستان کی زندگی میں اپنا کوئی اثر قائم کر سکے؟ بلکہ خاکم بدہن میں تو یہ پوچھوں گا

کہ اس نوبت پر کیا یہ ان حوادث کے مقابلہ میں جن کا سیلاب روز افزوں تیزی کے ساتھ آ رہا ہے اپنے بقیہ اعضاء کو مزید قطع و برید سے اور خود اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے؟

اسی کا نتیجہ ہے کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کے برعکس اب خود مسلمانوں کے گروہ میں اسلام سے بغاوت اور انحراف کی وبا پھیل رہی ہے سارے ہندوستان میں اور اس کے اطراف و اکناف میں کہیں بھی نظام اسلامی اپنی پوری مشینری کے ساتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ لوگ اس کے جمال و کمال کو دیکھیں اور درخت کو اس کے پھلوں سے پہچانیں۔ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ یہی اعضاء بریدہ اسلام ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ بس اسلام یہی ہے۔ اس کو دیکھ کر بعض تو علانیہ کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو مسلمان ہونے سے بس انکار نہیں کرتے باقی تمام باتیں ایسی کرتے ہیں کہ ان میں اور منکرین اسلام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بہت سوں کے دل پھر گئے ہیں، مگر چونکہ ابھی صریح بغاوت برپا نہیں ہوئی ہے اس لیے وہ منافقت کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہیں اور بغاوت کے جراثیم پھیلا رہے ہیں تاکہ جب عام بلویٰ شروع ہو جائے تب خود بھی اپنا جھنڈا لے کر کھڑے ہوں۔ کچھ لوگ صاف نہیں کہتے مگر دبی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ نئی قومیت اور نئی تہذیب میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ یہ تن مردہ جسے تم لیے بیٹھے ہو، نہ خود تمہیں کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ ان فوائد ہی سے متمتع ہونے دیتا ہے جو دوسروں میں جذب ہونے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اب مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ اسلام کا باضابطہ مُثلہ کر ڈالا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل کی حد تک مسلمان رہنا چاہیے باقی زندگی کا سارا پروگرام وہی اختیار کر لینا چاہیے جو غیر مسلموں نے سکھایا ہے اور جس کو غیر مسلم اختیار کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ خود دھوکے میں ہیں یا دھوکہ دینا چاہتے ہیں، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ تمام معاملات زندگی میں غیر اسلامی نظریات اختیار کرنے اور غیر اسلامی اصول پر عامل ہو جانے کے بعد مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل خود ہی بے معنی

ہو جاتے ہیں۔ نہ ان پر زیادہ مدت تک ایمان باقی رہ سکتا ہے اور نہ عمل جاری رہ سکتا ہے اس لیے کہ یہ عقائد اور یہ عبادات تو وہ بنیادیں ہیں جن کو اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ زندگی کی پوری عمارت ان پر تعمیر ہو۔ جب یہ عمارت دوسری بنیادوں پر تعمیر ہو گئی تو ان آثار قدیمہ سے بے فائدہ و بے ضرورت دلچسپی کب تک باقی رہ سکے گی۔ نئے نظام زندگی میں جو بچہ پرورش پا کر جوان ہو گا وہ پوچھے گا کہ چند لاحاصل عقیدوں اور چند بے نتیجہ رسموں کا یہ قلادہ کیوں میرے گلے میں ڈال رکھا ہے؟ میں کیوں اس قرآن کو پڑھوں اور کیوں اس پر ایمان رکھوں جس کے سارے احکام اب بے کار ہو چکے ہیں؟ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو ایک انسان گذر چکا ہے آج اس کو میں کس لیے خدا کا رسول مانوں؟ جب اِس زندگی میں وہ میری رہنمائی ہی نہیں کرتا تو محض اس کی رسالت تسلیم کر لینے سے فائدہ کیا اور نہ تسلیم کرنے سے نقصان کیا؟ یہ نظام حیات جس پر میں عمل کر رہا ہوں؟ اس میں نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے اور روزہ رکھنے یا نہ رکھنے سے کیا فرق واقع ہوتا ہے؟ کیا ربط ہے ان اعمال اور اس زندگی کے درمیان؟ یہ بے جوڑ پیوند میری زندگی میں آخر کیوں لگا رہے؟ ——— یہ منطقی نتیجہ ہے دین اور دنیا کی علیحدگی کا اور جب یہ علیحدگی اصولاً اور عملاً مکمل ہو جائیگی تو یہ نتیجہ رونما ہو کر رہے گا۔ جس طرح نظام جسمانی سے الگ ہو جانے کے بعد قلب بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح زندگی سے بے تعلق ہو جانے کے بعد عقائد اور عبادات کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ عقائد اور عبادات اسلامی زندگی کو قوتِ حیات دیتے ہیں اور اسلامی زندگی عقائد اور عبادات کو طاقت بہم پہونچاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ان دونوں میں ایک زندہ نظام جسمانی کے اعضا کا سا تعلق ہے جسے منقطع کر دینے کا لازمی نتیجہ دونوں کی موت ہے۔ غیر اسلامی زندگی میں اسلامی عقائد اور عبادات کا پیوند بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے گوریلا کے جسم میں انسانی دماغ اور انسانی دست و پا۔

یہ نہ سمجھیے کہ اسلام کی موجودہ حالت کا یہ اثر صرف نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک مختصر گروہ پر ہی مترتب ہو رہا ہے۔ نہیں۔ آج جو لوگ سچے دل سے مسلمان ہیں، جن کے دلوں میں اس مذہب کی

محبت اور عزت موجود ہے، خواہ نئے گروہ کے لوگ ہوں یا پرانے گروہ کے، ان سب پر کم و بیش ان حالات کا اثر پڑ رہا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کا درہم برہم ہو جانا ایک عام مصیبت ہے جس کے طبعی نتائج سے کوئی مسلمان بھی محفوظ نہیں ہے اور نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہم سب کو اس میں سے حصہ مل رہا ہے۔ اور ہمارے علما و مشائخ بھی اس میں اتنے ہی حصہ دار ہیں جتنے مدرسوں اور کالجوں سے نکلے ہوئے لوگ۔

لیکن سب سے زیادہ خطرہ میں ہمارے وہ عوام ہیں جو کروروں کی تعداد میں ۱۶ لاکھ مربع میل کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس صرف "اسلام" کا نام باقی ہے جس سے ان کو غیر معمولی محبت ہے۔ نہ علمی حیثیت سے یہ غریب اس چیز سے واقف ہیں جس پر یہ اس طرح جان دے رہے ہیں۔ اور نہ عملی حیثیت سے کوئی ایسا نظام زندگی موجود ہے جو انہیں غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ہر گمراہ کرنے والا ان کے عقائد کو اور ان کی زندگی کو اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹا سکتا ہے۔ بس انھیں اتنا اطمینان دلا دینا کافی ہے کہ یہ ضلالت جو ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، یہی عین ہدایت ہے یا کم از کم اسلام کے خلاف نہیں ہے، اس کے بعد آپ جس راستے پر چاہیں انھیں بھٹکالے جا سکتے ہیں، خواہ وہ قادیانیت کا راستہ ہو یا اشتراکیت کا۔ پھر ان کے روز افزوں افلاس اور ان کی ہولناک معاشی خستہ حالی نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں، ان کو موجودہ بے نظمی کی حالت میں اصول اسلام کے مطابق حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں کوئی منظم جماعت ایسی موجود نہیں جو اشتراکیت کے مقابلہ میں اسلام کے معاشی و تمدنی اصولوں کو لے کر اٹھے اور ان مسائل کو حل کر کے دکھا دے جو عام مسلمانوں کے لیے فی الواقع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کروروں مفلس و فاقہ کش مسلمانوں کی یہ بھیڑ اشتراکی مبلغین کے لیے نہایت سہل الحصول شکار بن گئی ہے۔ بورژوا طبقہ کے جن لوگوں میں

حوصلہ مندی اور اقتدار کی حرص ذرا اعتدال سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ ہمیشہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے نئی نئی تدبیریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب روسی انقلاب نے اس طبقہ کے ایک گروہ کو ایک اور تدبیر سکھا دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسان اور مزدور کے حامی بن کر غریب عوام کو اپنے ہاتھ میں لیں، ان کے اندر خود غرضی حرص اور حسد کی آگ بھڑکائیں، ان کے جائز حقوق سے بڑھ کر انہیں دولت میں حصہ دلوانے کا لالچ دلائیں، خوشحال طبقوں کی جائز دولت تک چھین کر ان میں تقسیم کر دینے کا وعدہ کریں، اور اس طرح ملک کے سواد اعظم کو اپنی مٹھی میں لے کر وہ اقتدار حاصل کریں جو سرمایہ داری نظام کے پادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور کروڑپتیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ غیر مسلم عوام سے بڑھ کر مسلم عوام سے توقعات رکھتے ہیں کیونکہ معاشی حیثیت سے مسلمان زیادہ خستہ حال ہیں۔ یہ ان کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ، ہم وہ طریقہ بتائیں "جس سے امیری اور غریبی مرتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے۔" پھر جب بیچارا بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی امید پر انکی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں، اور یہ جذبہ اس کے دل میں پیدا کرتے ہیں کہ دین اور ایمان کوئی چیز نہیں، اصل چیز روٹی ہے، وہ جس طریقے سے ملے وہی دین ہے اور اسی میں نجات ہے:۔

"غریبوں مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پالینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب نہیں"

یہ ابتدائی سبق ہے مذہب اشتراکیت کا اور جس آن یہ سبق بیچارے جاہل و مفلس مسلمانوں کو دیا جاتا ہے، اسی آن انھیں اس امر کا اطمینان بھی دلا دیا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مذہب کو ہاتھ نہیں لگاتے:

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ، اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے[1]۔"

گذشتہ ۲۰ سال کے اندر روسی اشتراکیت کے جو اثرات مسلمانان روس کی نوخیز نسلوں پر مترتب ہوئے ہیں وہ جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہی مستقبل مسلمانان ہند کے سامنے بھی دھمکیاں دیتا ہوا آ رہا ہے۔ پیٹ کی آگ متاع ایمان کو خاکستر کر دینے کے لیے بڑھ رہی ہے۔ ابھی تک یہ سرچشمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے ایک سلائی سے بند کیا جا سکتا ہے لیکن اگر غفلت کے چند سال یوں ہی گذار دیے گئے، تو یہ اتنا بڑا سیلاب بن جائیگا کہ اس کے مقابلے میں ہاتھیوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔

طریق کار ان حالات میں محض مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لاحاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح کے لیے ایک رسالہ نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد میں بھی شائع کر دیے جائیں تو یہ حالات روبراہ نہیں آ سکتے۔ محض زبان اور قلم سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کر دینے سے کیا فائدہ؟ ان خوبیوں کو واقعات کی دنیا میں سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ محض یہ کہدینے سے کہ اسلام کے اصولوں میں زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے، کیا یہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے؟ اسلام میں بالقوۃ جو کچھ موجود ہے اس کو بالفعل بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کشمکش اور جدوجہد کی دنیا ہے۔ اس کی رفتار محض باتوں سے نہیں بدلی جا سکتی۔ اس کو بدلنے کے لیے انقلاب انگیز جہاد کی ضرورت ہے۔ اگر اشتراکی اپنے غلط اصولوں کو لے کر نصف صدی کے اندر دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اپنا اثر واقتدار قائم کر سکتے ہیں، اگر فاشست اپنے غیر معتدل طریقوں کو لے کر دنیا پر اپنی دھاک بٹھا سکتے

[1] یہ دونوں فقرے جو یہاں نقل کیے گئے ہیں۔ ایک مسلمان صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو "مدینہ" جیسے کثیر الاشاعت مسلم اخبار کی

ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جن کے پاس حق اور عدل کے غیر فانی اصول ہیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا سکہ نہ جما سکیں۔ مگر یہ سکہ نرے وعظ و تلقین سے نہیں جم سکتا۔ اس کے لیے سعی و عمل کی ضرورت ہے، اور انہی طریقوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جن سے سنت اللہ کے مطابق دنیا میں سکہ جما کرتا ہے۔

اسوۂ رسول اللہ

"انقلاب انگیز جدوجہد" ایک مبہم لفظ ہے۔ اس کی عملی صورتیں بہت سی ہیں اور بہت سی ہوسکتی ہیں۔ جس قسم کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہو اس کے لیے وہی صورت اختیار کرنی پڑے گی جو اس انقلاب کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہو۔

ہم جو انقلاب چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں کوئی نئی صورت تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ انقلاب اس سے پہلے برپا ہو چکا ہے۔ جس پاک انسان نے (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلی مرتبہ یہ انقلاب برپا کیا تھا، وہی اس کی فطرت کو خوب جانتا تھا، اور اسی کے اختیار کیے ہوئے طریقہ کی پیروی کر کے آج بھی یہ انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ اس پاک ہستی کی سیرت ایک لحاظ سے معجزہ ہے، مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے۔ وہ اخلاق، وہ تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ شخصیت وہ انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات اب کوئی انسان کہاں سے لاسکتا ہے؟ اس لیے اب کوئی انسان اتنا کمال درجہ کا انقلاب بھی کہاں برپا کرسکتا ہے؟ اس لحاظ سے وہ معجزہ ہے اور قیامت تک کے لیے معجزہ ہے۔ لیکن اس انسان اکبر نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا طبعی خاصہ وہی انقلاب انگیزی ہے جس کی نظیر ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کے سامنے آچکی ہے۔ اس نمونہ کی جتنی زیادہ پیروی کی جائے گی اور جس قدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کی جائے گی، اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اُس پہلے انقلاب سے اتنے ہی زیادہ اقرب ہوں گے جو اصل نمونہ کی طاقت سے برپا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسوہ ہے اور قیامت تک کے لیے اسوہ ہے۔ بیسویں صدی ہو یا چالیسویں صدی۔ ہندوستان ہو یا امریکہ یا روس، جہاں اور جس وقت چاہیں آپ اسی نوعیت کا انقلاب برپا کرسکتے ہیں، بشرطیکہ

اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا، اس کی تفصیلات یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ "دارالاسلام" کا تخیل اسی اسوۂ پاک کے غائر مطالعہ سے پیدا ہوا ہے۔

آنحضرت جب مبعوث ہوئے تو روئے زمین پر ایک شخص بھی مسلم نہ تھا۔ آپ نے اپنی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی اور آہستہ آہستہ متفرق طور پر ایک ایک دو دو چار چار آدمی مسلمان ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اگرچہ پہاڑ سے زیادہ مضبوط ایمان رکھتے تھے، اور ایسی فدویت ان کو اسلام کے ساتھ تھی کہ دنیا ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، مگر چونکہ متفرق تھے، کفار کے درمیان گھرے ہوئے تھے، بے بس اور کمزور تھے، اس لیے اپنے ماحول سے لڑتے لڑتے ان کے بازو شل ہو ہو جاتے تھے اور پھر بھی وہ ان حالات کو نہ بدل سکتے تھے جن کو بدلنے کے لیے وہ اور ان کے ہادی و مرشد فداہ ابی و امی کوشش فرما رہے تھے۔ ۱۳ سال تک حضور اسی طرح جدوجہد کرتے رہے اور اس مدت میں سرفروش اہل ایمان کی ایک مٹھی بھر جماعت آپ نے فراہم کرلی۔ اس کے بعد اللہ نے دوسری تدبیر کی طرف آپ کی ہدایت فرمائی اور وہ یہ تھی کہ ان سرفروشوں کو لے کر کفر کے ماحول سے نکل جائیں ایک جگہ ان کو جمع کرکے اسلامی ماحول پیدا کریں۔ اسلام کا ایک گھر بنائیں جہاں اسلامی زندگی کا پورا پروگرام نافذ ہو۔ ایک مرکز بنائیں جہاں مسلمانوں میں اجتماعی طاقت پیدا ہو۔ ایک ایسا پاور ہاؤس بنائیں جس میں تمام برقی طاقت ایک جگہ جمع ہو جائے اور پھر ایک منضبط طریقہ سے وہ پھیلنی شروع ہو یہاں تک کہ زمین کا گوشہ گوشہ اس سے منور ہو جائے۔ مدینہ طیبہ کی جانب آپ کی ہجرت اسی غرض کے لیے تھی۔ تمام مسلمان جو عرب کے مختلف قبیلوں میں منتشر تھے، ان سب کو حکم دیا گیا کہ سمٹ کر اس مرکز پر جمع ہو جائیں۔ یہاں اسلام کو عمل کی صورت میں نافذ کرکے بتایا گیا۔ اس

پاک ماحول میں پوری جماعت کو اسلامی زندگی کی ایسی تربیت دی گئی کہ اس جماعت کا ہر شخص ایک چلتا پھرتا اسلام بن گیا جسے دیکھ لینا ہی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور کس لیے آیا ہے۔ ان پر اللہ کا رنگ (صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ) اتنا گہرا چڑھایا گیا کہ وہ جدھر جائیں دوسروں کا رنگ قبول کرنے کے بجائے اپنا رنگ دوسروں پر چڑھا دیں ان میں کیرکٹر کی آہنی طاقت پیدا کی گئی کہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوں اور جو ان کے مقابلے میں آئے ان سے مغلوب ہو کر رہ جائے۔ ان کی رگ رگ میں اسلامی زندگی کا نصب العین اس طرح پیوست کر دیا گیا کہ زندگی کے ہر عمل میں وہ مقدم ہو اور باقی تمام دنیوی اغراض ثانوی درجہ میں ہوں ان کو تعلیم اور تربیت دونوں کے ذریعہ سے اس قابل بنا دیا گیا کہ جہاں جائیں زندگی کے اسی پروگرام کو نافذ کر کے چھوڑیں جو قرآن و سنت نے انھیں دیا ہے، اور ہر قسم کے بگڑے ہوئے حالات کو منقلب کر کے اسی کے مطابق ڈھال لیں۔

یہ حیرت انگیز تنظیم تھی جس کا ایک ایک جزء گہرے مطالعہ اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ اس تنظیم میں کام کو چار بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(۱) ایک گروہ ایسے لوگوں کا تیار کیا جائے جو دین میں تفقہ حاصل کریں اور جن میں یہ استعداد ہو کہ لوگوں کو دین اور اس کے احکام بہترین طریقہ پر سمجھا سکیں۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ (التوبہ: ۱۵)

(۲) کچھ لوگ ایسے مہیا رکیے جائیں جن کی زندگیاں اسلام کے نظام العمل کو قائم کرنے اور پھیلانے کی سعی و جہد کے لیے وقف ہوں۔ جماعت کا فرض ہے کہ ان کو کسب معیشت سے بے نیاز کر دے لیکن خود انہیں اس کی پروا نہ ہو۔ چاہے معیشت کا کوئی انتظام ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ اپنے دل کی لگن سے مجبور ہوں اور ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے اس کام میں لگے رہیں جو ان کی

زندگی کا واحد نصب العین ہے۔ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران : ۱۱)۔

(۳) پوری جماعت میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ ہر ہر شخص اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھے۔ وہ اپنے دنیا کے کاروبار چلاتا رہے مگر ہر کام میں یہ مقصد اسکے سامنے ہو۔ تاجر اپنی تجارت میں، کسان اپنی زراعت میں، صناع اپنے پیشے کے کام میں اور ملازم اپنی ملازمت میں اس مقصد کو کبھی نہ بھولے۔ وہ ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھے کہ یہ سب کام جینے کے لیے ہیں اور جینا اس ایک کام کے لیے ہے۔ وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرے، اپنے اقوال و افعال اور اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلام کے اصول کی پابندی کرے اور جہاں دنیوی فوائد میں اور اصول اسلام میں تقیض واقع ہو جائے وہاں فوائد پر لات مار دے اور اصول کو ہاتھ سے دے کر اسلام کی عزت کو بٹہ نہ لگائے۔ پھر وہ جتنا مال اور جتنا وقت اپنی ذاتی ضروریات سے بچا سکتا ہو اس کو اسلام کی خدمت میں صرف کر دے اور ان لوگوں کا ہاتھ بٹائے جنہوں نے اپنی زندگیاں اس کام کے لیے وقف کی ہیں۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران : ۱۲)۔

(۴) باہر کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ دار الاسلام میں آئیں اور اس ماحول میں رہ کر کلام اللہ کا مطالعہ کریں جہاں کی ساری زندگی اس کلام پاک کی عملی تفسیر ہے۔ کفر کے ماحول کی بہ نسبت اسلام کے ماحول میں وہ قرآن کو زیادہ بہتر سمجھیں گے اور زیادہ گہرا اثر لے کر واپس جائیں گے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ (التوبہ ۱)

صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں دنیا کے اس سب سے بڑے ہادی و رہبر نے مدینہ کے پاور ہاؤس میں اتنی زبردست طاقت بھر دی کہ اس نے دیکھتے دیکھتے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے

نکل کر اس کی روشنی روئے زمین پر پھیل گئی، حتیٰ کہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گذر چکے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس اب بھی طاقت کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔

ہم اسی پاور ہاؤس کی نقل اتارنا چاہتے ہیں۔ وہ عظیم الشان طاقت تو ہم گناہ گار کہاں سے لائیں گے مگر جب ہم اسکی نقل اتاریں گے تو کچھ نہ کچھ طاقت تو ہم میں پیدا ہی ہوگی محدب شیشہ جب آفتاب سے نسبت پیدا کریگا تو کچھ نہ کچھ حرارت تو اس میں مرتکز ہو ہی جائیگی۔ ساری دنیا نہ سہی، ہندوستان ہی سہی، اور سارا ہندوستان بھی نہ سہی، اس کا ایک حصہ ہی سہی۔ اگر ایک حصہ میں بھی ہم آفتاب رسالت سے لی ہوئی روشنی اور حرارت پھیلا سکے تو ہماری زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اللہ دوسروں کو بھی توفیق دیگا کہ یہی کام ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی کریں۔

دارالاسلام کی مختصر اسکیم دارالاسلام کا منصوبہ دراصل اسی نمونہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد جب نظام اسلامی میں بہت کچھ برہمی پیدا ہوگئی تو صوفیائے اسلام نے بھی اسی طریقہ کی پیروی میں جگہ جگہ خانقاہیں قائم کی تھیں۔ آج خانقاہ کا مفہوم اس قدر گر گیا ہے کہ یہ لفظ سنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسی جگہ کا تصور آجاتا ہے جہاں ہوا اور روشنی کا گذر نہ ہو، جہاں صدیوں تک جنتری کا ورق نہ پلٹے۔ مگر اصل میں یہ خانقاہ بھی اسی نمونہ کی ایک نقل تھی جسے سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قائم کیا تھا۔ صوفیائے کرام جن لوگوں میں اچھی استعداد پاتے تھے ان کو بیرونی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدت تک خانقاہ میں رکھتے تھے اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دے کر انھیں اسی کام کے لیے تیار کرتے تھے جس کے لیے مرشد اعظم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تیار کیا کرتے تھے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جو لوگ سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، جن کے دلوں میں حوصلے ہیں مگر پراگندگی و انتشار کی وجہ سے مایوس ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں، ان کو جہاں تک ممکن ہو رفتہ رفتہ ایک مرکز پر جمع کریں اور دارالاسلام میں ان کی اجتماعی طاقت سے

خالص اسلامی ماحول پیدا کردیں۔ پھر کام کو اسی طرح چار شعبوں میں تقسیم کیا جائے جس طرح وحی خداوندی کے تحت سرکارؐ نے تقسیم کیا تھا۔

(۱) ایک شعبہ ایسا ہو جس میں اعلیٰ درجہ کی علمی استعداد کے لوگ شامل ہوں۔ ان میں سے جو لوگ علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں انھیں مغربی زبانوں سے اور علوم جدیدہ سے روشناس کیا جائے۔ اور جن حضرات نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی ہو انہیں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دیجائے۔ پھر یہ لوگ قرآن اور سنت کا گہرا مطالعہ کرکے دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کریں۔ اس کے بعد ان کے مختلف گروپ بنا دیئے جائیں۔ ہر گروپ ایک ایک شعبۂ علم کو لیکر اس میں اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز پر مرتب کرے، زندگی کے جدید مسائل کو سمجھے اور اصول اسلام کے مطابق ان کا حل تلاش کرے، علوم کی بنیاد میں جو مغربی نقطۂ نظر پیوست ہوگیا ہے اس کو نکال کر اسلام کے نقطۂ نظر سے علوم کو از سر نو مدون کرئے اور اپنی تحقیقات سے ایسا صالح لٹریچر پیدا کرے جو اسلام کی موافقت میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

(۲) دوسرا شعبہ ایسا ہو جس میں خدمت اسلام کے لیے اچھے کارکن تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ پاکیزہ اخلاق، مضبوط سیرت، دُھن کے پکے اور اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ قربان کردینے والے لوگ، جو دیہات اور شہروں میں جائیں، اصول اسلام کے مطابق مسلمانوں کی تنظیم کریں، ان کے اخلاق کی اصلاح کریں، ان میں اسلام کا علم پھیلائیں، ان کے معاشی و تمدنی مسائل کو صحیح طریق پر حل کریں، اور اس حل کو اتنی کامیابی کے ساتھ عمل میں لاکر بتائیں کہ ہمارے غیر مسلم ہمسائے جو کسی بہتر حل سے واقف نہ ہونے ہی کی وجہ سے اشتراکیت کے راستے پر چلے جا رہے ہیں، اس سے بہتر چیز کو کامیاب ہوتے دیکھ کر اسی سے استفادہ کرنے پر مائل ہو جائیں۔ ان لوگوں کو ایک سلک میں منسلک کیا جائے گا تاکہ جہاں جہاں یہ کام کریں ان کا ایک ہی پروگرام ہو اور ایک ہی مرکز سے وابستہ رہیں۔ نیز اس

امر کی بھی کوشش کی جائے گی کہ جتنے لوگوں کو تنظیم و اصلاح کی خدمت پر لگایا جائے ان کی ضروریات زندگی حد درجہ مختصر ہوں، اور ان مختصر ضروریات سے انہیں بے نیاز کر دیا جائے۔

(۳) تیسرے شعبہ میں ایسے لوگ رہیں جو صرف تھوڑی مدت کے لیے دارالاسلام میں مقیم رہ کر واپس جانا چاہتے ہوں۔ انہیں دین کا علم اور اخلاقی تربیت دے کر چھوڑ دیا جائے کہ جہاں چاہیں رہیں مگر مسلمان کی طرح رہیں، دوسروں سے متاثر ہونے کے بجائے ان پر اپنا اثر ڈالیں، اپنے اصولوں میں سخت ہوں، اپنے عقائد میں مضبوط ہوں، بے مقصد زندگی نہ بسر کریں، ایک نصب العین ہر حال میں ان کے سامنے ہو، پاک طریقوں سے روزی کمائیں اور اس کا ایک حصہ ان لوگوں کی اعانت میں صرف کریں جنہوں نے اپنی زندگی اسی مشترک نصب العین کی خدمت کے لیے وقف کی ہے، نیز جتنا وقت بھی اپنی ضروریات سے بچا سکیں اس کو اسی خدمت میں صرف کریں۔

(۴) چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ہو جو محض عارضی طور پر دارالاسلام میں آکر کچھ علمی استفادہ کرنا چاہیں یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہشمند ہوں۔ ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائینگی اور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ وہ دارالاسلام سے اچھا اثر لے جائیں

رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں | یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے اس نظام کا جسے ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اور ہماری کامیابی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ ہمارا یہ نظام اپنی روح اور اپنے جوہر میں مدینہ طیبہ کے اس مثالی نظام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔ مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھے۔ اتباع رسولؐ و اصحاب رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے، اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک

سلف صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں، جس قسم کے وہ کھانے کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں جیسا طرز معاشرت ان کے گھروں میں تھا بعینہٖ وہی طرز معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو، تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل ایک متحجر (Fossilised) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں، اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کرکے اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے، درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈراما بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے، بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستہ پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے، اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے۔ ہم کو "خیر امت" جو بنایا گیا ہے، تو یہ اس لیے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (Rear Guard) کی حیثیت سے لگے رہیں، بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے، ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اور ہمارے خیر امۃ ہونے کا راز اُخرجت للناس میں پوشیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہم

کرنی چاہیے، یہ ہے کہ انہوں نے قوانین طبعی کو قوانین شرعی کے تحت استعمال کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں اسلامی تہذیب کی روح پھونک دی۔ اس وقت جتنی طبعی قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو چکی تھی، ان سب کو انہوں نے اس تہذیب کا خادم بنایا، اور غلبہ و ترقی کے جس قدر وسائل تمدن نے فراہم کیے تھے ان سے کام لینے میں وہ کفار و مشرکین سے سبقت لے گئے تاکہ خدا سے بغاوت کرنے والوں کی تہذیب کے مقابلہ میں خدا کی خلافت سنبھالنے والوں کی تہذیب کامیاب ہو۔ اسی چیز کی تعلیم خدا نے اپنی کتاب میں ان کو دی تھی کہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ ان کو یہ سکھایا گیا تھا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی قوتوں سے کام لینے کا حق کافر سے زیادہ مسلم کو پہنچتا ہے بلکہ اس کا اصلی حق دار مسلم ہی ہے پس نبیؐ و اصحابِ نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقار اور قوانین طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اول میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ ریڈیو بجائے خود ناپاک نہیں ہے۔ ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو داروغۂ ارباب نشاط یا ناشر کذب و افترار بناتی ہے۔ اور اس ناپاک تہذیب کو فروغ اسی لیے ہو رہا ہے کہ اس کو فروغ دینے کے لیے خدا کی پیدا کی ہوئی تمام ان طاقتوں سے کام لیا جا رہا ہے جو اس وقت تک انسان پر منکشف ہوئی ہیں۔ اب اگر ہم اُس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں جو الٰہی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ہم پر عائد ہوتا ہے تو ہمیں بھی انہی طاقتوں سے کام لینا چاہیے۔ یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اس سے کام لے گا وہی کامیاب ہوگا خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی ہی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اُسے بھگتنی پڑے گی کیونکہ اس عالم اسباب

میں خدا کی جو سنت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔

فرقہ بندی نہیں | اس تصریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ "دارالاسلام" کی تحریک نہ تو ایک ارتجاعی (Reactionary) تحریک ہے، اور نہ اس قسم کی ارتقائی تحریک ہے جس کے پیش نظر صرف مادّی ارتقاء ہو۔ اس کے لیے گرو کل کانگڑی، ستیہ گرہ آشرم، شانتی نکیتن اور ویال باغ میں کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی صحیح نمونہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف مدینۃ الرسول ہے۔

دارالاسلام کے دروازے تمام مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں، خواہ وہ اسلام کے کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں[1]۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ کون کس مذہب فقہی یا کس مذہب کلامی کا پیرو ہے۔ ہم اصل اسلام اور پوری امت مسلمہ کی خدمت کے لیے اٹھے ہیں، اس لیے ہر وہ شخص ہمارا رفیق بن سکتا ہے جس کے پیش نظر یہی مقصد ہو۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ آپ کھلے دل اور آزاد نظر سے اسلام کے مآخذ اصلیہ کا مطالعہ کیجیے۔ اس کے بعد فرق اسلامیہ میں سے جس فرقہ کے طریقہ کو آپ پسند کریں اسے اختیار کر سکتے ہیں مگر اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھیے کہ تاویل سے جو مذہب پیدا ہوتا ہے وہ "دین" نہیں ہے بلکہ دین کے مذاہب میں سے ایک مذہب ہے، اور اس مذہب سے جو فرقہ وجود میں آتا ہے وہ "امت" نہیں ہے بلکہ امت کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے، لہٰذا آپ کے اندر اسلامی عصبیت کے سوا کوئی اور عصبیت نہ ہونی چاہیے۔ فقہ اور عقائد کے جزئیات میں اختلاف ہونا تو ایک امر فطری ہے، عقول و اذہان کا اختلاف جب تک باقی ہے اس کو بند نہیں کیا جا سکتا، اور شارع کا مقصد بھی اس کو بند کرنا نہیں ہے۔ البتہ جس چیز کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنیاد پر دین اور امت کے ٹکڑے کر ڈالے جائیں اور ہر ٹکڑا اپنی علیحدہ عصبیت قائم کر کے دوسرے ٹکڑے سے اس طرح جدا

---

[1] قادیانی حضرات ہمیں معاف فرمائیں، انھیں اسلامی فرقوں میں شمار کرنے سے ہم معذور ہیں۔ انہوں نے ہمارے اور اپنے درمیان جدید نبوت کی دیوار ایسی کھڑی کر دی ہے جس کی وجہ سے ہم اور وہ ایک امت کے دائرہ میں جمع نہیں ہو سکتے۔

ہو جائے کہ گویا اس کا دین الگ ہے اور اس کی امت الگ ہے۔ یہی مصداق ہے اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ کا، اور اسی سے یہ کہکر روکا گیا ہے کہ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ۔

فرقہ بندی کی اس بیماری سے بچنے کے لیے دار الاسلام کے قواعد میں یہ بات شامل کی گئی ہے کہ جو لوگ وہاں رہیں وہ اختلافی مسائل پر بحث وجدال ومناظرہ سے پرہیز کریں، اور سب بلا امتیاز مذہب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھیں۔

مالی مسئلہ | اس تمام داستان کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ سوال ناظرین کے دل میں کھٹکا ہوگا کہ کام تو بہت اچھا ہے اور کرنے کا ہے، مگر روپے کا کیا انتظام ہوگا؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ دنیا نے جس چیز کو قاضی الحاجات سمجھ رکھا ہے، ہم اس کو قاضی الحاجات نہیں سمجھتے۔ اصل چیز روپیہ نہیں ہے بلکہ عزم وارادہ ہے۔ یہ کام جو ہم کرنا چاہتے ہیں اسے ہم نے پیشے کے طور پر اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ یہ ہمارا مقصد زندگی ہے، اور خدا کے بھروسہ پر ہم یہ ارادہ کر چکے ہیں کہ اپنی زندگی کے اس مقصد کو پورا کرکے چھوڑیں گے۔ ہمارے اس ارادے میں جتنی زیادہ قوت ہوگی، خدا کی طرف سے اتنے ہی زیادہ اسباب ہماری مساعدت کے لیے جمع ہوتے چلے جائیں گے، البتہ خدا کی یہ سنت ہمیشہ رہی ہے اور اس میں کسی کے لیے استثنا نہیں ہے کہ وہ ارادوں کی طاقت کا امتحان ضرور لیا کرتا ہے، سو ہم تو یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہیں، اور پہلے کیے دیتے ہیں کہ جو لوگ ہماری رفاقت کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اس کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ ہمارے پاس نہ تنخواہیں ہیں، نہ وظائف ہیں، نہ یہاں چندے کا کاروبار ہے اور نہ جلوسوں اور لغو کی بھاگ دوڑ۔ جن لوگوں کو روزگار کی تلاش ہو یا جنہیں شہرت یا ناموری مطلوب ہو انکے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ اپنی زندگی کا وہی مقصد رکھتے ہوں جو ہماری زندگی کا ہے، اور وہی

امتحان دینے کے لیے تیار ہوں جس کے لیے ہم تیار ہوئے ہیں، تو ان کے لیے دار الاسلام میں جگہ موجود ہے۔ جس حد تک وہ اپنی روزی کا انتظام کر سکتے ہوں وہ خود کریں، اور جس حد تک ہم ان کی مدد کر سکیں گے اس میں دریغ نہ کریں گے۔ یہ تو مشترک مقصد کے لیے ایک مشترک جہاد ہے۔ اس میں خدمت کے معاوضہ کا کوئی سوال ہی نہیں، یہاں نہ کوئی معاوضہ دینے والا ہے نہ لینے والا۔ البتہ خدمت میں باہمی امداد و معاونت بلحاظ استطاعت سب پر لازم ہے۔

یہ ابتدا ہی سے ارادہ کر لیا گیا ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا جائے گا۔ اب تک جو کچھ کام ہوا ہے، دار الاسلام کے رفقاء نے اپنی ذات سے کیا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی کریں گے اپنی ذات سے کریں گے۔ اگر کوئی شخص خود اپنے فرض کو محسوس کرے، اور اس کام میں روپیہ صرف کرنے کو خود اپنی غرض سمجھے جس طرح ہم سمجھتے ہیں تو وہ لائے، ہم اس سے بخوشی لیں گے۔ لیکن اگر کوئی اسے اپنی غرض نہیں بلکہ ہماری غرض سمجھتا ہے تو ہم غرضمند نہیں ہیں، ہم اس کے پاس مانگنے کے لیے کبھی نہ جائیں گے۔

آیندہ سے ترجمان القرآن میں وقتاً فوقتاً دار الاسلام کی اطلاعات شائع ہوتی رہیں گی تاکہ ناظرین اس کام کی رفتار سے واقف ہوتے رہیں۔

کتابتِ قرآن

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ

جناب مولوی قمر الدین صاحب جمالپوری۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ)

(ذیل کا مضمون علامۂ موسیٰ جار اللہ روستوفدونی کی تاریخ القرآن سے ماخوذ ہے علامۂ ممدوح روس کے اکابر علما میں سے تھے اور زمانۂ جدید میں دنیائے اسلام نے جو اعاظم رجال پیدا کئے ہیں ان کی صف اول میں مرحوم نے جگہ پائی تھی۔ ان کی یہ کتاب جس سے یہ مضمون ماخوذ ہے ۱۳۲۳ھ میں سینٹ پیٹرس برگ سے شائع ہوئی تھی)

اہمیت کتابت اس عالم کون و فساد میں کسی چیز کو بقاء دوام نہیں۔ کسی چیز کو ابدیت کا جامہ پہنانے کی کوشش، حقیقۃً گردش ایام کے خلاف جنگ ہے اگر اس عالم میں کوئی چیز ایسی ہے جو کسی حد تک اس کے آہنیں ہاتھوں کی دست رس سے محفوظ ہے تو وہ کتابت ہی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی علم کو ابدی و دوامی حیثیت دینا چاہتا ہو تو اس کے لیے کتابت سے بہتر و محکم تر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کتابت ایک ایسی محافظ ہے کہ جو چیز اس کے حوالہ کر دی جائے وہ کم ضائع ہوتی ہے ایک ایسا خزانہ ہے جس کے مخزونات میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا نہ موت کا خطرہ نہ نسیان کا ڈر۔ جب انسانی دل و دماغ اس کے اندر تحریف کرنا چاہتے ہیں تو یہی وہ چیز ہے جو ناطق یا مُحِق ثابت ہوتی ہے۔ فردوسی نے جب سلطان محمود جیسے اولوالعزم شہنشاہ کی شان میں کسی شکر رنجی اور کبیدگی خاطر کی وجہ سے ہجو لکھی تو وہ شاہانہ سطوت و جبروت

کے باوجود اس ہجو کا ایک حرف بلکہ ایک نقطہ بھی محو نہ کر سکا۔ کتابت دراصل انسان کی شریف ترین صفات میں سے ہے۔ اسی نے علوم و فنون کو ہم تک پہنچایا، گذشتہ قوموں کے حالات و واقعات سے ہم کو آگاہی بخشی، اسرار و معارف اور حکم نادرہ سے ہمیں مطلع کیا، اور معلومات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے بکھیر دیا۔ یہ صدیوں کی دیرینہ خبریں آنے والی قوموں تک پہنچا دیتی ہے، گذشتہ اقوام کے کارناموں، عبرت ناک حوادث اور ان کے فلسفہ عروج و زوال سے واقف و آگاہ کرتی ہے۔

ابتدائے تاریخ تدوین قرآن کریم

کتابت کے انہی فوائد کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداہی سے قرآن مجید کو لکھوانے کا انتظام فرمایا تھا۔ اگرچہ قرآن کی حفاظت کے لیے انسان کی دوسری اہم ترین صفت یعنی قوت حافظہ سے بھی پوری مدد لی گئی، مگر آپ نے صرف اسی پر اعتماد نہیں کر لیا، بلکہ ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعہ سے بھی قرآن کو محفوظ کرنے کی کوشش فرمائی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ کلام مجید ایک ہی مرتبہ اس مرتب صورت میں جیسا کہ فی الحال ہماری نظروں کے سامنے ہے، نازل نہیں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ حوائج انسانی کا اندازہ داں ہے۔ اس نے جب کوئی ضرورت دیکھی فوراً جبرئیل وحی لے کر آموجود ہوئے۔ اس وحی کو آنحضرتؐ صحابہ کرام کو سنا دیتے اور انھیں حفظ بھی کرا دیتے تھے۔ دربار رسالت میں کاتبین وحی موجود رہتے، وہ فوراً لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن حاشا کہ اللہ یہ سلسلہ تحریر سہو و نسیان کے خوف سے جاری نہ تھا۔ کیونکہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ کی تسکین بخش تسلی سے حضور کو مطمئن کر دیا گیا تھا کہ آپ قرآن کا کوئی لفظ بھول نہیں سکتے۔ پس درحقیقت لکھوانے کا مقصد یہ نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی یادداشت کے لیے قرآن کو محفوظ کرا رہے تھے، بلکہ مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے یہ ہدایت نامہ محفوظ ہو جائے اور وہ آئندہ کے لیے بھی اس کی حفاظت کا اہتمام کریں۔ جس طرح آپ کے زمانے میں کلام پاک کا حفظ کرنا واجب تھا اسی طرح اس کا ضبط کرنا بھی زمانہ نبوت کے بعد واجب ہو گیا تھا جس کی آپ نے تاکید بھی کی تھی۔ کتابت کی فرضیت کا سبب یہ تھا کہ خداوند قدوس نے وعدہ کیا تھا

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (یعنی ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں)۔ خدا نے مسلمانوں کو اس وعدہ کا امین بنا دیا۔ امین کا یہ فرض ہے کہ امانت کی حفاظت میں سخت احتیاط برتے، مضبوط سے مضبوط طریقۂ کار عمل میں لائے اور ہر ممکن تدبیر اختیار کرے۔ انھیں اسباب کی بنا پر ہمارے اسلاف نے مصاحف کی تدوین کی۔ کلام مجید کی حفاظت میں ہر ممکن تدبیر سے کام لینا ان کا اولین فرض تھا کہ کسی مکار اور کسی بہکانے والے کی وسوسہ اندازی کا قرآن مجید میں دخل نہ ہو، نہ وہم کا امکان ہو نہ ظن باطل کا گذر، کیونکہ کلام پاک کی تحریف خواہ وہ نظم و ترتیب میں ہو خواہ رسم الخط میں، عمداً یا سہواً بالقصد ہو یا بغیر قصد امت مسلمہ کے لیے گمراہ کن ثابت ہوگی۔ یہ خیال ان کے دماغ پر اس طرح مسلط ہوگیا تھا کہ کوئی چیز ہر وقت ان کو قرآن کی حفاظت کے لیے نت نئی تدبیروں پر اکساتی رہتی تھی، اور وہ دائماً اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ باطل کسی طرف سے بھی اس کتاب پاک کے قریب نہ آسکے۔

تاریخ تعلیم قرآن فتح مکہ کے بعد آنحضور صلعم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو مکہ میں اسی خدمت (تعلیم قرآن) پر مامور فرمایا۔ اکابر صحابہ میں جن کی تعداد ہزاروں تک تھی ایسے اشخاص موجود تھے جو کلام پاک کی تعلیم کے اور حفظ قرآن کے دلدادہ تھے۔ ان کے اعتنار و اہتمام کا یہ عالم تھا کہ دن رات میں کتنی ہی بار وہ قرآن کی آیتوں کو دہرا لیا کرتے تھے۔ ان کی مشغولیتوں اور مصروفیتوں کا یہ حال تھا کہ کلام پاک کے ضبط و حفظ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ مسجد نبوی میں جب حفاظ قرآن کی تلاوت سے آوازیں گونجتیں اور آپ سنتے تو خدا کے شکر گذار ہوتے اور فرماتے احسان اور فضل ہے اس مالک کا جس نے میری امت میں ایسے سرگرم لوگوں کو پیدا کیا۔ فی الحقیقت اسی اہتمام و سرگرمی عمل کا نتیجہ تھا کہ آغاز اسلام ہی میں کلام پاک سینوں میں محفوظ ہوگیا تھا۔ تھوڑا تھوڑا حصہ نازل ہوتا جاتا تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نہایت صحت اور احتیاط کے ساتھ اس کو یاد کرتے جاتے تھے۔ ایک طرف خود حضور کو اللہ تعالی نے اطمینان

دلا دیا تھا کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ (ہم تمہیں پڑھائیں گے اور تم اسے بھولوگے نہیں) اور دوسری طرف آپ کے متبعین اپنے سینوں میں اس کو محفوظ کر رہے تھے اور کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ تھی جس کو یاد رکھنے والے کثیر التعداد لوگ نہ ہوں لیکن آنحضورؐ نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا۔ متعدد صحابہ کو جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اس خدمت پر مامور کیا کہ جوں جوں آیات اترتی جائیں وہ ان کو آپ کی ہدایت کے مطابق اپنی اپنی جگہ پر لکھتے چلے جائیں۔ احادیث شاہد ہیں کہ نبی اکرم صلعم صحابہ کرام کو سورتوں کی کی ترتیب و نظم سے واقف کرادیا کرتے تھے اور پوری تشریح و توضیح کے ساتھ بتادیا کرتے تھے کہ فلاں آیت فلاں سورہ میں اس آیت کے بعد یا قبل رکھو اور اس آیت کو اس جگہ ترتیب دو یہی نہیں بلکہ کلام پاک کے نظم و ترتیب سے واقف کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ نماز تھی۔ جس طرح وہ آیتوں کو وحی کے بعد قلم بند کرلیا کرتے تھے اسی طرح نماز میں وہ کلام پاک کی ترتیب سے واقف ہوتے جاتے تھے۔ متعدد احادیث میں (جن کا اس موقع پر ذکر کرنا باعث طول ہوگا) یہ تصریح موجود ہے کہ آنحضور صلعم ختم قرآن سنا دیا کرتے تھے اور صحابہ کرام بھی پورا پورا کلام مجید آپ کو سناتے رہتے تھے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ہم نے کلام پاک آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ کو یہ بات بہت پسند آئی اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے زمانے ہی میں کلام پاک پورا لوگوں کو یاد تھا اور کتابی صورت میں لوگوں کے پاس مرتب تھا۔ صحابہؓ منزل من اللہ آیتوں کو اسی وقت کاپیوں اور کاغذوں، تختیوں اور پتوں وغیرہ پر لکھ لیا کرتے تھے۔ کتابت وحی ان کے نزدیک فرض تھی جس سے کسی صورت میں بے اعتنائی اور بے توجہی جائز نہ تھی حتیٰ کہ جس زمانہ میں اسلام گھروں کے اندر محصور تھا، لوگ خوف وخطر کی وجہ سے اسلام کا اظہار نہیں کرتے تھے اس فرض کی طرف سے اس وقت بھی تغافل نہ ہوا۔ مسلمان ظلم و ستم کی بارشوں سے بچنے کے لیے گھروں میں چھپ کر تلاوت اور کتابت کا کام انجام دیتے تھے کہ کہیں کفار کے جبر و استبداد کی بارشوں سے اسلام کے ابھرنے والے

نقوش سطح عالم سے مٹ نہ جائیں۔ حضرت عمرؓ کے اُس واقعہ سے جو ان کی بہن اور نسبتی بھائی کے ساتھ اسلام لانے سے قبل پیش آیا تھا پتہ چلتا ہے کہ مسلمان خوف و خطر میں گھر کر بھی کس طرح اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

عرب اور کتابت | آنحضور صلعم کی ولادت کے وقت یا اس سے قبل عرب میں لکھنے کا رواج عام نہ تھا لیکن اعلیٰ اور اہم چیزیں ضرور قلم بند کی جاتی تھیں مثلاً فصیح و بلیغ قصائد و خطب۔ صحابہ کرام میں بھی ایسے لوگ کافی تعداد میں تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے تھے کہ یہ (چند احادیث کے مجموعہ کی طرف اشارہ کرکے) احادیث ہیں جن کو میں نے نبی اکرم صلعم سے سنکر لکھ لیا تھا۔ اور بھی بہت سے صحابہ تھے جو زبانی یاد کی ہوئی آیتیں لکھ لیا کرتے تھے اور آنحضورؐ سے اس کی تصحیح بھی کرالیا کرتے تھے۔ انھیں میں سے چند لوگ وحی کے منصب کتابت پر مامور تھے۔ مثلاً حضرات علیؓ، عثمانؓ، عمرؓ، زید بن ثابتؓ، ابن مسعودؓ، ابن مالکؓ، عبداللہؓ بن سلام وغیرہم۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو ان کو آپ املا کراتے تھے اور ان آیتوں کو یکے بعد دیگرے سنکر تصدیق فرماتے تھے۔ چنانچہ اسی طرح آپ کی زندگی ہی میں کلام پاک پورا ضبط ہو چکا تھا۔ لکھنے کے وسائل اگرچہ اس زمانہ میں عربوں کے پاس بہت کم تھے، لیکن مہتم بالشان چیزوں کو محفوظ کرنے کے لیے جو وسائل اس زمانہ میں استعمال کیے جاتے تھے وہ سب انہوں نے اس کلام عزیز کی حفاظت کے لیے صرف کردیے تھے۔

جو لوگ قرآن کی حفاظت میں شک کرتے ہیں انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ مسلمان اس کلام پاک کے حفظ اور اس کی ترتیب کتابت سے کیسے قطع نظر کرسکتے تھے جب کہ ابتدا ہی سے یہ بات ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی کہ یہی کلام ان کے لیے دینی و دنیوی سعادتوں کا سرچشمہ ہے اور اس کا ضائع ہونا ان کے مذہب کی بنیاد کا منہدم ہونا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ کلام مجید ہی تقرب الی اللہ

کا واحد ذریعہ ہے اس لیے ان کی یہ تمنا اور کوشش تھی کہ یہ محفوظ رہے۔

وصال نبوی کے بعد تکمیل وتتمیم اسلام اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا کی آیت نازل ہونے کے بعد جب سید کونین آنحضور صلعم دار فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے تو آپ نے امت کو اس حال میں چھوڑا کہ اسلام جزیرۂ عرب میں پوری طرح تسلط پا چکا تھا، عرب کا چپہ چپہ نور اسلام سے منور ہو چکا تھا یمن و بحرین، عمان و نجد کی پہاڑیوں میں زندگی بسر کرنے والے مُضَر و ربیعہ و قضاعہ کے مقبوضہ ممالک، طائف اور مکہ، سب کے سب مشرف باسلام ہو چکے تھے، مسجدیں اس کثرت سے تعمیر ہو چکی تھیں کہ کوئی شہر یا گاؤں یا محلہ ایسا نہ تھا جس میں مسجد نہ ہو اور اس کے اندر اوقات نماز میں کلام پاک کی آیتیں تلاوت نہ کی جاتی ہوں، ہر مرد و عورت، بوڑھا اور جوان کلام پاک جانتا اور پڑھتا تھا۔ اس وقت مسلمان اپنی اصلی حالت پر تھے۔ اسلامی اعتقادات میں کچھ فرق نہ تھا۔ سب ایک امت تھے، سب کا دین واحد تھا اور ان کے اندر کامل اتحاد و اتفاق تھا۔ آپ کی طاقت ور شخصیت اٹھ جانے کے بعد امت میں پہلا فتنہ جو برپا ہوا وہ ارتداد کا فتنہ تھا۔ اس فتنہ میں اہل عرب چار جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔ پہلی جماعت وہ تھی جس کے اندر کسی طرح کا تغیر نہ تھا۔ وہ اسی اپنی اصلی حالت پر تھی۔ دوسری جماعت وہ تھی جس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تیسری جماعت وہ تھی جو دین سے پھر گئی تھی اور اپنے ارتداد کا بیباکانہ اعلان کرتی پھرتی تھی۔ چوتھی جماعت وہ تھی جو ان میں سے کسی میں بھی شامل نہ تھی بلکہ وہ انتظار کر رہی تھی کہ دیکھیں فتح و نصرت کا پلہ کس طرف جھکتا ہے اسی طرف ہم بھی ہو رہیں گے۔ یہ فتنہ اگرچہ بہت بڑا فتنہ تھا، اور اس نے ایک وقت میں اسلام کی زندگی ہی کو خطرہ میں ڈال دیا تھا، لیکن قرآن پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جیسا متفق علیہ تھا ویسا ہی رہا، اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا۔

حضرت فاروق اعظمؓ اور قرآن کی تدوین کا احساس

یہ فتنہ جب فرو ہو چکا تو حضرت عمر کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی دوسرا فتنہ نہ اٹھے اور اس سے قرآن پر کوئی آنچ آجائے۔ چنانچہ آپ نے رائے دی کہ کلام پاک کاتبین وحی اور حافظین وحی کی سعی و کوشش سے صحابہ کرام کے سامنے جمع کیا جائے تا کہ پھر کسی کو شبہ اور اختلاف نہ ہو حضرت ابو بکرؓ نے اس سے اتفاق فرمایا اور زید بن ثابت کو بلا کر مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ٹال دینا اور دریا کا رخ بدل دینا کلام پاک کی تدوین سے کہیں آسان و سہل ہے لیکن بعد کو مصالح معلوم کر کے وہ بھی اسی نقطہ پر آگئے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے ان حفاظ قرآن کو بلایا جو قابل اعتماد تھے اور جن کی دیانت عام طور پر مسلم تھی۔ ان میں سب سے زیادہ کلام پاک کی تدوین میں جن کی ضرورت تھی اور جو قابل اعتماد تھے وہ مندرجۂ ذیل اشخاص ہیں:

حضرت ابی بن کعبؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن زبیرؓ۔ حضرت ابن عباسؓ۔ حضرت ابن سائبؓ۔ حضرت خالد بن ولیدؓ۔ حضرت طلحہؓ۔ حضرت سعدؓ۔ حضرت حذیفہؓ۔ حضرت سعیدؓ۔ حضرت سالمؓ۔ حضرت ابو ہریرہؓ۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ حضرت ابو زیدؓ۔ حضرت ابو درداؓ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ۔ حضرت عمرو بن العاصؓ۔ یہ تمام حضرات پہلے حضرت عمر فاروق کے مکان میں جمع ہوئے۔ کلام پاک کے ضبط و تدوین کی صورتوں پر غور و فکر کیا اور ہر شخص کے فرائض کی تقسیم ہوئی۔ پھر رائے یہ ٹھیری کہ خدا کا کلام خانۂ خدا ہی میں جمع کیا جائے۔

ضبط و تدوین کا کام شروع ہوا۔ مدینہ کے اطراف میں اعلان کیا گیا کہ جس کے پاس جسقدر بھی کلام مجید کا حصہ محفوظ ہو وہ جامعین قرآن کے حوالہ کر دے۔ اس اعلان کے مطابق جس کے پاس کلام مجید کا جتنا مجموعہ تھا خواہ کاپیوں یا منتشر اوراق پر یا جھلیوں اور ہڈیوں پر یا کھجوروں

کھجوروں کے پتوں پر لاکر حاضر کر دیا جس سے کلام پاک کی تدوین میں بہت آسانیاں پیدا ہوگئیں
کن حضرات کی تحریریں قابل اعتماد تھیں | لیکن تحریر اس شخص کی مقبول ہوتی تھی جو ثقہ ہو اور جس کی تحریر
آنحضور صلعم کی آنکھوں کے سامنے ہوئی ہو۔ جس کے پاس جو سرمایہ کلام الٰہی کا محفوظ تھا۔ وہ پیش کرتا
تھا۔ پھر ایک شخص کی تحریر دوسرے کی تحریر سے ملائی جاتی تھی تاکہ احتمال کی گنجائش باقی نہ رہے۔
کتابت کی خدمت حضرت زید بن ثابت رضؓ کے ذمہ تھی جسے انہوں نے کامل جانفشانی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ
فرماتے ہیں کہ جب میں سورۂ توبہ کی اس آیت تک پہونچا:
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ۔ تو اس کے بعد کی آیت نہیں ملتی تھی جس کی
بنا پر سخت تشویش لاحق ہوئی، بہت تلاش و جستجو کے بعد حضرت خزیمہ ابن اوس بن زید انصاری رضؓ
کے پاس ملی جب ہم سورۂ احزاب تک پہنچے تو پھر ایک آیتہ کا سراغ نہیں ملتا تھا جسے میں نے رسول اللہ
کو پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ بڑی فکر ہوئی کہ کسی طرح مل جائے۔ خدا خدا کرکے یہ آیت بھی حضرت خزیمہ
بن ثابت رضؓ کے یہاں مرقوم ملی اور وہ آیت اسی سورہ میں شامل کر دی گئی۔ اس طرح کلام پاک
کی تدوین پوری ہوئی۔ نہایت صحیح اور مکمل تدوین۔
اختتام تدوین کی شاندار تقریب | جب قرآن کی تدوین کا کام بخیر و خوبی انجام کو پہنچا تو اس کی
تقریب میں مسرت و شادمانی کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں تمام حفاظ اور دیگر صحابہ جمع
ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے کلام پاک پڑھ کر سب کو سنایا تمام صحابہ کرام نے بغور سنا اس وقت
صحابہ کی جانب سے نہ اعتراض ہوا نہ اختلاف اور نہ اس کے بعد کبھی اس کی نسبت کچھ سننے میں آیا
کلام پاک کی اس جمع و ترتیب پر تمام صحابہ کا اجماع و اتفاق ثابت ہونے کے بعد یہ نہیں کہا
جا سکتا اور نہ یہ کہنا کسی صداقت پسند آدمی کے لیے ممکن ہے کہ کسی نے شائد کوئی من گھڑت آیت قرآن میں شامل
کر دی ہو۔ تدوین کا کام صحابہ کی ایک کثیر جماعت نے مل کر انتہائی احتیاط کے ساتھ کیا تھا۔ یہ سب کے

سب پورے یا کچھ کم و بیش قرآن کے حافظ تھے اور آنحضرت صلعم کی زندگی میں ہزاروں مرتبہ آپ سے سن چکے تھے۔ ہر ہر آیت جو لکھے ہوئے پرچوں سے لیکر مصحف میں شامل کی گئی، اس کے آیت قرآنی ہونے پر کثیر التعداد گواہ موجود تھے۔ ایسی حالت میں کسی کے لیے کوئی موقع ہی نہ تھا کہ ایک حرف بھی قرآن میں گھٹا یا بڑھا سکتا۔

حضرات شیخین کا وصال اور شورشوں کا سیلاب اس فرض کی تکمیل کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی کا وصال ہو گیا آپ آسمان اسلام کا سب سے زیادہ روشن ستارہ تھے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ سچ پوچھیے تو قرآن پاک کی تدوین کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ آپ کے بعد حضرت عمر رضی کے ایام حکومت میں شام، مصر، ایران اور الجزیرہ فتح ہوئے۔ ان ممالک میں کوئی شہر ایسا نہ تھا جس میں بکثرت مسجدیں تعمیر نہ ہوئی ہوں مصاحف کی کتابت اور حفظ کا اہتمام ہر جگہ تھا۔ ائمہ نمازوں میں قرآن پاک پڑھتے اور لوگ تلاوت کرتے تھے۔ مشرق سے مغرب تک مدرسے جاری ہو چکے تھے جن میں بچوں کو باقاعدہ کلام مجید کی تعلیم دی جاتی تھی یہ صورت عمل دس سال اور کئی ماہ تک جاری رہی۔ اس مدت میں قرآن مجید کی اتنی اشاعت ہوئی کہ پورے قرآن کے حافظوں کی تعداد ہزاروں سے اور اجزاء قرآن کے حافظوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو گئی اور ہزاروں ہی مصاحف تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئے۔ حضرت عمر نے قرآن کی اشاعت کا جو اہتمام کیا ہوگا اس کا اندازہ ہر تاریخ داں کر سکتا ہے۔ جو شخص ایک ایک مسلمان فقیر اور ایک ایک یتیم کی خبر گیری میں اتنا اہتمام کرتا ہو کہ راتوں کو چین سے سو نہ سکتا ہو، جس نے حرمین کی آبادی کو قحط سے بچانے کے لیے نہر خلیج نیل سے کھدوا کر بحر قلزم میں ملائی ہو کہ مصر سے غلہ کی کشتیاں آسانی سے حجاز تک پہنچ جائیں، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا شخص اس چیز سے کیسے غفلت کر سکتا تھا جس پر اسلام کے وجود اور مسلمانوں کی زندگی کا مدار تھا؟

خلافت عثمانی جب حضرت عمر کا وصال ہوا اور حضرت عثمان ابن عفان خلیفہ ہوئے تو آپ کے

عہد میں کچھ ایسے فتنہ پرداز اور کج فہم لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے کلام مجید میں تحریف کر کے مسلمانوں میں اختلاف و افتراق اور تفرق و تشتت کا بیج بونا چاہا اور ان کے درمیان نزاع کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس وقت صورت حال اس کی مقتضی ہوئی کہ قرآن مجید کا ایک مستند ایڈیشن نکالا جائے اور اسے کثرت سے پھیلایا جائے تاکہ مسلمان ان فتنہ پردازوں کے شر سے محفوظ ہو جائیں چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے صحابہ کو جمع کیا جن کی تعداد بارہ ہزار سے زیادہ تھی اور کلام اللہ کا وہ نسخہ جو حضرت حفصہؓ (ام المومنین) کے یہاں محفوظ رکھا تھا طلب کیا یہ وہی نسخہ تھا جو تمام صحابہ کے اتفاق سے حضرت ابوبکر کے عہد میں مرتب ہوا تھا۔ حضرت عثمان نے زید بن ثابت، عبداللہ ابن زبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ اس کی پانچ نقلیں کریں۔ صحابہ کے مجمع میں ان کی تصدیق کرائی۔ پھر حضرت زیدؓ کو مدینہ، حضرت عبداللہ بن سائبؓ کو مکہ، حضرت مغیرہ بن شہابؓ کو شام، حضرت ابو عبدالرحمن سلمیؓ کو کوفہ، حضرت عامر بن قیسؓ کو بصرہ ایک ایک نسخہ دیکر اس غرض سے بھیجا کہ فتنہ پردازوں کی فساد انگیزی کے جو پودے ابھی نکل رہے ہیں ان کا فوراً استیصال کر دیا جائے چنانچہ جب یہ لوگ اپنے اپنے متعینہ مقامات پہنچے تو وہاں کے مسلمان اپنا اپنا قرآن مجید لے لے کر جوق درجوق ان لوگوں کے پاس آئے اور انہیں سنا کر اختلافات کی اصلاح کی اور اپنی غلطیوں پر متنبہ ہو کر واپس گئے۔ اس طرح اس فتنے کی بیخ کنی ہو گئی۔

خلافت علی رضی اللہ عنہ: حضرت عثمان کی شہادت کے بعد اسلام کو سخت خطرات اور نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ باہمی اختلافات میں اضافہ ہوتا گیا اور فرق باطلہ کا آغاز ہوا۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ تخت خلافت پر متمکن ہوئے جن کی خلافت کا زمانہ پانچ سال نو ماہ ہے۔ اس وقت مسلمان دو فرقوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ایک طرف حضرت علی کے جان نثاروں کی جماعت تھی۔ دوسری طرف حضرت معاویہؓ کے جانبازوں کی اگرچہ یہ فتنہ ایسا سخت تھا کہ اس نے اسلام کی جڑیں ہلا دیں مگر اس دور میں

کلام مجید کی نسبت کوئی اختلاف نہ ہوا۔ ہر جگہ کے لوگ کلام پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ حضرت علیؓ خود امامت فرماتے تھے اور حضرت ابو بکرؓ و عمر رضی اللہ عنہما کی تدوینِ کلام مجید پر تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اگر خدانخواستہ خلیفہ اول و دوم یا خلیفہ سوم کی جانب سے کلام مجید میں کوئی کمی یا بیشی، تقدیم یا تاخیر ہوئی ہوتی یا تحریف کا دخل ہوتا تو کیا حضرت علیؓ ان کے مدون کردہ کلام مجید پر اتفاق کر سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ انہوں نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد خلفاءِ ثلاثہؓ کے اس کارنامۂ عظیم پر ستائش اور تعریفیں کیں حالانکہ اگر تغیر و تبدل ہوتا تو وہ اس کی مذمت کرتے اور حکومت کی باگ سنبھالنے کے بعد اسے علی حالہٖ ہرگز باقی نہ رہنے دیتے اگر یہ مان لیا جائے کہ اہل بیت کے بارے میں کچھ حصہ نازل ہوا تھا (جیسا کہ ایک جماعت کا خیال ہے) تو کیا اور آیتوں کی طرح عوام کا اس پر تواتر نہ ہوتا؟ ضرور ہوتا، وہ آیتیں بھی آنحضور صلعم سے سنی گئی ہوتیں اور شائع و ذائع ہوتیں ایسی چیز کا چھپا دینا آفتاب کو غائب کر دینے سے مشکل تر تھا۔

بدگمانیوں کا منشا اب تک تاریخ قرآن کی نسبت جو کچھ ہم نے تحریر کیا ہے وہی واقعیت اور حقیقت ہے۔ لیکن ایک آدمی اگر اس وقت ٹھوکر کھائے جب کہ آفتاب نصف النہار پر چمک کر سارے عالم کو روشن کر رہا ہو تو یہ اس کا قصور نظر ہے آج جو کوئی بھی قرآن کے محفوظ ہونے میں شک کرتا ہے اس کے پاس بدگمانی ہی بدگمانی ہے۔ دلیل کوئی نہیں، اور جو شخص محض مخالفت پر تلا ہوا ہو لیکن اپنے پاس کوئی دلیل نہ رکھتا ہو اس کی بات کا دنیا میں کوئی اعتبار نہیں۔

کلام پاک کے بارے میں جو بدگمانیاں پھیلائی گئی ہیں ان کی نسبت ایک ایسی جماعت کی طرف ہے جنہوں نے معتمد و صحیح حدیثوں سے بے پروا ہو کر بہت سی لایعنی اور ناقابل توجہ خبروں (حدیثوں) کو روایت کر دیا ہے اور ایسے اقوال پیش کیے ہیں جن کا تمام عالم میں کوئی شاہد نہیں۔

عدم تحریف پر ناقابل انکار دلائل اس امر کا تو کوئی شخص تصور ہی نہیں کر سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی

میں قرآن کے اندر تحریف ہو سکتی تھی پھر جب آپ اس دار فانی سے تشریف لے گئے تو صحابہ کرام کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی اور ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو کلام پاک کا ایک کافی حصہ یاد نہ ہو۔ ہزاروں ایسے بھی تھے جن کو پورا کلام مجید حفظ تھا۔ یہ لوگ تمام عرب میں پھیلے ہوئے تھے اور زمانہ مابعد میں عرب سے باہر بھی اسلام کے مفتوحہ ممالک میں پھیل گئے تھے۔ ان لوگوں کی زندگی میں قرآن مجید کے نسخے لکھے گئے اور ان کی ہزارہا نقلیں ممالک اسلامیہ میں شائع ہوئیں۔ اگر کلام پاک کے اندر ایک لفظ کی تحریف و تصحیف بھی کوئی شخص کرتا تو اختلاف عظیم برپا ہو جاتا۔ جھگڑے اور فساد ہوتے۔ خون خرابوں تک نوبت پہنچتی۔ کوئی کہتا کہ یہ لفظ قرآن کا ہے اور کوئی کہتا کہ نہیں ہے ممکن نہ تھا کہ اس پر اختلافات برپا نہ ہوتے اور ان اختلافات کی آگ ساری دنیائے اسلام میں نہ پھیل جاتی لیکن تاریخ اسلام میں کہیں کوئی کوئی ادنیٰ سی مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ مسلمانوں کے درمیان کبھی اس قسم کا کوئی اختلاف برپا ہوا ہو ہم نے آج تک کبھی نہیں سنا کہ کسی مسلم یا غیر مسلم نے کلام پاک کی کسی آیت میں اختلاف کیا ہو یا دعویٰ کیا ہو کہ یہ اصل قرآن کی آیت نہیں ہے۔ اگر رائی کے ایک دانہ برابر بھی اختلاف ہوا ہوتا تو زمانہ مابعد میں فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق کہ ایک پودا پہلے زمین سے اگتا ہے پھر آہستہ آہستہ ایک موٹا تنا ور درخت بن جاتا ہے، تغیرات و اختلافات کی بھرمار ہو جاتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عالم واقعہ میں ایسی کوئی چیز پیش نہیں آئی کلام الٰہی اپنی عمر کی ۱۳۵۰ منزلیں طے کر چکا ہے اور آج تک کوئی ایسا نسخہ نہ ملا جس میں تحریف ہو۔

(۲) کلام پاک ہی نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ دین ظاہر ہوا تو اسی کے ذریعہ اسلام کی شان و شوکت، جاہ و جلال میں چار چاند لگائے تو اسی نے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے سامنے بڑے بڑے جباروں اور روساء نے جن کے دل سخت سے سخت دردناک واقعات اور لرزہ براندام کر دینے والے حادثات اور دل ہلا دینے والے سانحات سے بھی متاثر نہ ہوئے، بالآخر سر جھکا دیا، گھٹنے ٹیک دیے

اور اس کے اوامر و نواہی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ممکن نہ تھا کہ امت مسلمہ کلام ربانی کا یہ کرشمہ دیکھکر اس میں تحریف کی فکریں کرتی اور اگر خدانخواستہ ایسا کرنے کی کوئی جرأت بھی کرتا تو آپ دیکھتے کہ یہ قوم اپنے بدن کا آخری قطرہ بہا دینے میں بھی دریغ نہ کرتی۔

(۳) جس شخص کو صحابہ کی تاریخ معلوم ہوگی اور وہ صحیح احادیث پر ایک نظر ڈالے گا اسے معلوم ہو جائیگا کہ وہ کلام پاک کے حفظ اور اس کے ضبط میں کس قدر توجہ اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔ کلام پاک تو کلام پاک ہے احادیث کے ضبط و روایت میں اور ان کی نشر و اشاعت میں وہ جس توجہ اور اعتنا کو کام میں لاتے تھے جس حزم و دانائی سے قدم رکھتے تھے عیاں اور آشکارا ہے۔ عقل سلیم یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ جن لوگوں نے کلام بشر کی اس طرح حفاظت کی ہو وہ کلام خدا کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھ سکتے تھے۔ ان لوگوں کا حال تو یہ تھا کہ عہد جاہلیت کے اشعار تک کی حفاظت کرتے تھے، حالانکہ ان سے کوئی دینی غرض وابستہ نہ تھی اور ان پر قوم کی زندگی اور دین و دنیا کی فلاح کا مدار نہ تھا لیکن پھر بھی اگر کوئی شخص قدماء کے اشعار میں تغیر و تبدل کرتا تھا تو اس پر طعن و تشنیع کی بوچھار ہونے لگتی تھی۔ یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ غور کیجیے جب ان اشعار میں تحریف و تصحیف ممکن نہ تھی تو اس کا وقوع کلام مجید میں کیسے جائز ہو سکتا تھا جس کے متعلق لوگ جانتے تھے کہ یہی وہ چیز ہے جو نبوت کی دلیل بن سکتی ہے، یہی شریعت کی روح ہے، یہی رشد و ہدایت اور صراط مستقیم کی معرفت کا ذریعہ ہے، خیر و شر میں ما بہ الامتیاز ہے، آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہے اور اصل دین یہی کلام پاک ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو وہ راہ ہدایت سے دور ہوتے، ضلالت و گمراہی میں پڑے رہتے، ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے اور اصل راستہ کا پتہ نہ پاتے۔

(۴) عہد نبوت سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں قرآن مجید مسلمانوں کے درمیان اس طرح ظاہر اور نمایاں رہا ہے جیسے آفتاب تمام دنیا والوں کے سامنے ظاہر اور نمایاں ہے۔ اگر آفتاب کی سطح پر ذرا سا بھی تغیر ہو تو بیک وقت تمام دنیا والوں پر وہ عیاں ہو جائے گا اسی طرح قرآن کے اندر ادنی تغیر و تبدل بھی

ان نہیں کہ چھپا رہ جائے ہر زمانہ میں لاکھوں اور کروڑوں آدمی مختلف اغراض اور مختلف نقطہائے نظر سے قرآن اور اس کے ایک ایک لفظ سے دلچسپی لیتے رہے ہیں کسی کو حفظ قرآن سے دلچسپی ہے کسی کو قرات و تجوید سے دلچسپی ہے اور وہ ایک ایک لفظ کا صحیح تلفظ کرنے کی کوشش کر رہا ہے کسی کو رسم القرآن سے دلچسپی ہے اور وہ ایک ایک لفظ کے صحیح املاء سے اعتنار کر رہا ہے۔ کسی کو احکام القرآن سے دلچسپی ہے اور وہ کلام پاک کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا ہے تاکہ اس سے شرعی احکام کا استنباط اور قوانین اسلام کی تشریح کرے کچھ لوگوں کی غرض اس کی تفسیر، معانی کی معرفت، اسرار و غوامض سے واقفیت اور حقائق پر دسترس حاصل کرنا ہے کچھ لوگوں کی توجہات کو اس کی حد درجہ فصاحت، کمال بلاغت، اسلوب بیان نظم و ترتیب اور جملوں کے عجیب و غریب در و بست نے اپنی طرف مائل کر رکھا ہے، ایک جماعت اسے محض اس کی کرامات کا خیال کرکے پڑھتی ہے اور برکت وسعادت حاصل کرنے کے لیے ختم پر ختم کیے جاتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اس کلام میں شائد کوئی تحریف ہوئی ہو، اسے ایسا گمان کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ تمام دنیا کے مختلف گوشوں میں اتنے کثیر التعداد لوگ جو اتنے مختلف نقطہائے نظر سے اتنے مختلف زمانوں میں اس کلام سے اس قدر دلچسپی لیتے رہے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ ان سب نے بیک وقت متفق ہوکر کسی ایک آیت یا ایک لفظ میں ترمیم کر ڈالی ہو؟ ادنیٰ درجہ کی عقل بھی جس شخص کو میسر ہوگی وہ ا[illegible] نہ جھ سکتا، اور جب یہ ممکن نہیں ہے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ قرآن میں کبھی کوئی ایک شخص یا ایک گروہ کسی قسم کی تحریف کرے اور وہ تمام دنیا میں تسلیم کرلی جائے، یا تمام دنیا سے مخفی رہ جائے۔

(۵) صدر اول کے مسلمان یہود و نصاریٰ وغیرہم سے گھرے ہوئے تھے اور ہمیشہ رہے ہیں خصوصاً آن حضور صلعم سے تو انھیں سخت عداوت تھی آپ کے لیے اور آپ کی پوری قوم کے لیے فساد کا ایک جال بچھا رکھا تھا۔ پوری فضا زہر آلود بنا رکھی تھی۔ خود ہی بغض و عناد سے بھرے نہیں تھے بلکہ دوسروں کو بھی آپ کی دشمنی و عداوت پر آمادہ کرتے تھے۔ اس ماحول میں اگر غلطی سے صحابہ کرام معمولی تحریف و تصحیف کے

بھی مرتکب ہوئے ہوتے تو دشمنوں کی یہ جماعت ان پر فتنہ و فساد کی بوچھار کر دیتی تمام قبائل میں انکا راز فاش کرتی اور اس غلطی سے فائدہ اٹھا کر عام مسلمانوں کے سامنے ان کے سرداروں کو مجرم کی حیثیت سے لا کھڑا کر دیتی۔ یہی اسلام کا شیرازہ منتشر کر دینے کا سب سے زیادہ کارآمد ذریعہ اور ان کی یکجوئی کو نفاق و انتشار سے بدل دینے کا سب سے بڑا وسیلہ ہوتا۔ کفار کے علاوہ منافقین کی بھی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ یہ مسلمانوں کی مجلسوں میں شریک ہوتے ان کے ساتھ نمازیں ادا کرتے اور اس طرح ان کے تمام اندرونی حالات سے باخبر رہتے تھے۔ ان کو ہر وقت اسی بات کی تلاش رہتی تھی کہ مسلمانوں سے کوئی غلطی یا چوک ہو اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ معمولی معمولی باتوں، بے بنیاد خبروں اور بے اصل امور کو اچھال کر آسمان پر پہونچا دیتے تھے۔ رائی کو پہاڑ بنانے کی بے سود کوشش کرتے تھے۔ ان کے دست و بازو کی تمام کارفرمائیاں، دل و دماغ کی ساری کاوشیں اور اختراعات مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے وقف تھیں۔ اگر صحابہ کرام یا تابعین کے گروہ میں سے کوئی شخص قرآن میں ذرا سی بھی تحریف کرتا تو یہ لوگ زمین و آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ منافقین اور یہود و نصاریٰ جیسے شدید دشمنوں کی موجودگی میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہ تھا کہ تحریف قرآن جیسا جرم عظیم چھپا رہ جاتا اور اس پر کوئی فتنہ برپا نہ ہوتا [illegible] شاہد ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس کی مدت میں کبھی ایک مرتبہ بھی ان اعدائے [illegible] کو ایسا کوئی موقع نہ ملا۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے قرآن کی حفاظت کا کام مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ کافروں اور شدید ترین اعدائے اسلام سے بھی لے کر دکھا دیا ہے۔

"سچ" کے بجائے "صدق"

یکم مئی ۳۵ء سے ۱۷×۲۷/۴ ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر مہینہ کی یکم ۱ گیارہ ۱۱ اور اکیس ۲۱ کو شائع ہوتا ہے ہم کو معلوم ہے کہ صاحب ذوق حضرات جو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے طرز نشا پر کے عاشق ہیں اور آپ کے مخصوص دلنشین طرز صحافت کے لیے آپکے اخبار سچ کے بند ہونے کے بعد سے بیتاب تھے اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھیں گے۔ لہذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی للعہ پیسہ جار آرڈر جلد روانہ فرماکر خریداران کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرالیں ورنہ بعد کو پچھلے پرچے دستیاب نہونے پر پچھتانا پڑیگا۔

سالانہ چندہ (للعہ) **ترسیل زر بنام منیجر اخبار "صدق" ۴۳ ہیوٹ روڈ لکھنؤ**

بچوں کیلئے مفید کتابیں

سراپائے رسول اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک اور آپکے عادات و خصائل لباس معاشرت، اخلاق آداب و اطوار اور عام طرز زندگی کے متعلق تمام معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اور ان کو بہت سہل زبان دلکش انداز بیان میں لکھا گیا ہے جیبی تقطیع پر بہت خوبصورت طبع ہوتی ہے۔ قیمت ۴ر

ہمارے نبی کے صحابہ اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دلنشین انداز میں بیان کئے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق دینداری حسن معاشرت اور نیکی کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت قسم اول ۸ر قسم دوم ۶ر علاوہ محصول ڈاک۔

مسلمان بیبیاں یہ کتاب ہمارے نبی کے صحابہ کی طرح صحابیہ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے جس میں ان پاک ہستیوں کی زندگی کو مسلمان لڑکیوں کیلئے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ زبان اس قدر سادہ ہے کہ کم سن بچیاں بآسانی اس کو سمجھ سکتی ہیں قیمت ۸ر علاوہ محصول ڈاک

دفتر تجلیات القرآن سے طلب کیجیے

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرہ آفاق تصنیف

تمدن عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے اڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ

نواب جیون یار جنگ بہادر۔ بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا چیف جسٹس ہائیکورٹ حیدرآباد دکن کے

عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۳۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ

جس کی قیمت پچاس ۵۰ روپے تھی مگر سو ۱۰۰ روپے میں بھی نہیں ملسکتی تھی اب

اعلیحضرت فرمانروائے دکن مدظلہ

ن سیمین کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کیجانب سے شائع ہوچکی ہے

قیمت صرف پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

سید عبدالقادر

ٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پبلشر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار